www.cpsglobal.org

Al-Risala

July 2016 ● No. 476 ● Rs. 20
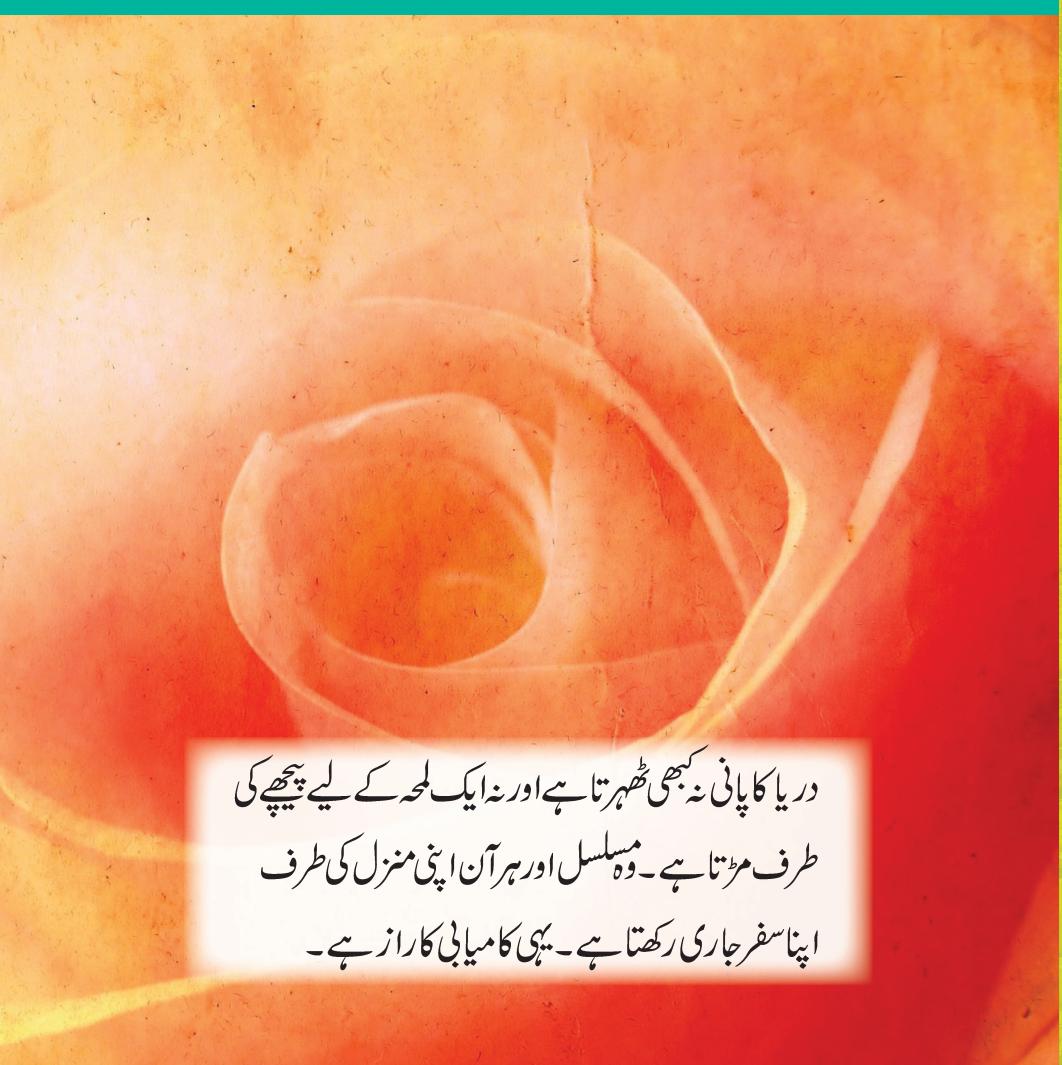
دریا کا پانی نہ کبھی ٹھہرتا ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے کی طرف مڑتا ہے۔ وہ مسلسل اور ہر آن اپنی منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 011-45760444
Mob. +91-8588822672, +91-8588822674
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates by Book Post
Single copy ₹20
One year ₹200
Two years ₹400
Three years ₹600
By Registered Post
One year ₹400
Two years ₹800
Three years ₹1200
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051
(Total Pages: 52)

جولائی 2016

فہرست

روزہ اور قرآن

قرآن خدا کی کتاب ہے۔ اس کو رمضان کے مہینے میں اُتارا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ رمضان کا مہینہ قرآن کا مہینہ ہے۔ چنانچہ امت میں قدیم زمانے سے یہ رواج ہے کہ رمضان کے مہینے میں قرآن کو بہت زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ قرآن کا یہ مطالعہ اگر سمجھ کر کیا جائے تو اس سے غیر معمولی دینی فائدہ حاصل ہوگا۔ رمضان میں قرآن کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے۔ رمضان میں رات کے وقت تراویح کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ یہ گویا حالت قیام میں قرآن کا اجتماعی مطالعہ ہے۔ نیز اعتکاف اس لیے ہے کہ رمضان کے مہینے میں آدمی کچھ دن ایسے گزارے، جب کہ وہ زیادہ سے زیادہ قرآن کے مطالعے میں مشغول رہے۔

ایک شخص روزہ رکھ کر قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ اس دوران وہ اس آیت تک پہنچتا ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (2:187)۔ اس آیت سے وہ دریافت کرتا ہے کہ رمضان شہر القرآن (قرآن کا مہینہ) ہے۔ پھر وہ قرآن کی تلاوت کے دوران یہ آیت پڑھتا ہے: كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (38:29)۔ اس آیت سے وہ یہ معلوم کرتا ہے کہ قرآن اس لئے آیا ہے کہ لوگ اس پر تدبر (غور وفکر) کریں۔ اس دریافت کے بعد وہ یہ طے کرتا ہے کہ رمضان کے مہینہ میں وہ قرآن کا مطالعہ کرے گا اور رمضان کے مہینہ میں کم ازکم ایک بار ضرور وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھے گا۔

روزہ قرآن کے مطالعے کی تحریک ہے۔ روزہ آدمی کو قرآن سے وابستہ کرتا ہے۔ روزہ آدمی کو اس مقصد کے لیے یکسو کرتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ روزہ دار گویا اپنے آپ کو قرآن کے مطالعے کے لیے فارغ کرتا ہے۔ روزہ کے مہینے میں آدمی کے اندر جو نفسیات بنتی ہے، وہ قرآن فہمی کے لیے خصوصی طور پر مفید ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ روزہ کا مہینہ آدمی کو قرآن سے قریب کرنے کا مہینہ ہے۔ روزے کا مقصد یہ ہے کہ آدمی تقوی کی اسپرٹ کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرے۔

شب قدر کس کے لیے

شب قدر (لیلۃ القدر) رمضان کے مہینے کی آخری عشرے میں کسی طاق رات کو آتی ہے۔ شب قدر کو پانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ رمضان کی جس رات کو آئے، وہ اپنے آپ روزے دار کو حاصل جائے۔ بلکہ اس کے لیے تیاری ضروری ہے۔ شب قدر کی برکت صرف اس انسان کو ملے گی جو تیار شخصیت کے ساتھ اس میں داخل ہو۔

شب قدر کا ذکر قرآن کی سورہ نمبر 97 میں آیا ہے۔ اس سورہ کا ایک جزء یہ ہے: تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ، سَلَامٌ (القدر: 5-6)۔ فرشتے اور روح اس رات میں اپنے رب کی اجازت سے اُترتے ہیں، ہر حکم لے کر۔ وہ رات سراسر امن ہے۔

On that night, the angels and the Spirit come down by the permission of their Lord with His decrees for all matters, it is all peace.

قرآن کی اس آیت کے مطابق، شب قدر امن کی رات (night of peace) ہے۔ شب قدر کے بارے میں قرآن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ تیار شخصیت (prepared personality) کون ہے جس کو فطرت کے قانون کے مطابق اس رات کی برکتوں میں حصہ ملے گا۔

یہ شخصیت پر امن شخصیت (peaceful personality) ہے۔ یعنی وہ شخصیت جس کو حقیقت کی دریافت اس طرح ہوئی ہو کہ وہ پورے معنوں میں مثبت سوچ (positive thinking) والا انسان بن گیا ہو۔ اس کی معرفت نے اس کے اندر خلق عظیم (القلم: 4) کی صفت پیدا کر دی ہو۔ اس کے نتیجے میں اس کا حال یہ ہو جائے کہ اس کے دل میں دوسروں کے لیے محبت اور خیر خواہی کے سوا کچھ نہ ہو۔ وہ تشدد پسند انسان کے بجائے امن پسند انسان بن گیا ہو۔ وہ ردعمل (reaction) کی نفسیات سے مکمل طور پر خالی ہو۔ یہی وہ انسان ہے جس کو شب قدر کی برکتیں حاصل ہوں گی۔

افضل انسان

ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: قيل لرسول الله صلى الله عليه و سلم: أي الناس أفضل؟ قال: كل مخموم القلب، صدوق اللسان، قالوا: صدوق اللسان، نعرفه، فما مخموم القلب؟ قال: هو التقي النقي، لا إثم فيه، ولا بغي، ولا غل، ولا حسد (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4216)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں افضل انسان کون ہے، آپ نے جواب دیا: وہ انسان جو مخموم القلب ہو، اور صدوق اللسان ہو۔ لوگوں نے کہا کہ صدوق اللسان (سچ بولنے والا) ہم جانتے ہیں، پس مخموم القلب کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا: یہ وہ انسان ہے جس کے اندر تقوی ہو، جو پاکباز ہو، جس کے اندر گناہ گاری نہ ہو، جس کے اندر سرکشی نہ ہو، جس کے اندر کینہ نہ ہو، جس کے اندر حسد نہ ہو۔ مخموم القلب کون ہے، اس کو اگر بدلے ہوئے الفاظ میں بتایا جائے تو وہ مثبت انسان (positive person) ہوگا۔ یعنی مخموم القلب انسان وہ ہے جو منفی سوچ (negative thinking) سے خالی ہو، جو مخالف حالات کے درمیان مثبت سوچ کے ساتھ جینے والا انسان ہو۔ جس کے دل میں ہر ایک کے لیے صرف مثبت جذبات پائے جاتے ہوں۔

ایسا انسان اپنے سماج کا بے مسئلہ انسان ہوگا۔ یہی وہ انسان ہے جو دعوت الی اللہ کے کام کے لیے اہل انسان ہے۔ اس کے دل میں ہر ایک کے لیے خیر خواہی ہوگی۔ اور خیر خواہی (well-wishing) کی صفت کے بغیر کوئی شخص دعوت الی اللہ کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ داعی صرف وہ انسان بن سکتا ہے جو انسان دوست (human-friendly) انسان ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مدعو کی طرف سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی ناخوشگوار بات پیش آتی ہے جو داعی کو منفی انسان بنا دے۔ اس لیے داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ یک طرفہ اخلاقیات کا حامل ہو، وہ ردعمل کی نفسیات سے پوری طرح پاک ہو۔ اس کے دل میں ہر ایک کے لیے ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہوں۔ جو انسان اس قسم کی مثبت شخصیت کا حامل نہ ہو، وہ کبھی دعوت الی اللہ کا کام مطلوب انداز میں انجام نہیں دے سکتا۔

امانت کیا ہے

خدا کے نقشۂ تخلیق کے مطابق، انسان امانت الٰہی کا امین ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کا بیان یہ ہے: ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے۔ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کی توبہ قبول کرے۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے (33:72-73)۔

امانت کا لفظی مطلب ٹرسٹ (trust) ہے۔ انسان کو جو امتیازی صفات دی گئی ہیں، وہ اس کے پاس بطور امانت ہیں۔ حدیث میں آیا ہے: خلق اللہ آدم علی صورتہ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6227) یعنی اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ جو صفتیں (attributes) خالق کے اندر کمال کے درجے میں پائی جاتی ہیں، وہ انسان کو شمّہ (iota) کے بقدر عطا کی گئی ہیں۔

ان صفات کے ساتھ انسان کو کامل اختیار دیا گیا ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنی اس آزادی کا غلط استعمال نہ کرے۔ بلکہ اس کو جائز حدود کے اندر استعمال کرے۔ جائز حدود کے اندر آزادی کو استعمال کرنے والے کے لیے ابدی زندگی میں جنت کا انعام ہے۔ اور جو شخص اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے، اس کے لیے جہنم کی سزا ہے۔

اس سلسلۂ بیان کا آخری حصہ یہ ہے: وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ مطلوب عمل سے مراد معیاری عمل نہیں ہے۔ انسان اپنی بشری کمزوری کی بنا پر ضرور غلطیاں کرے گا۔ اس لیے نجاتِ آخرت کا معیار غلطی سے پاک ہونا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ غلطی کرنے کے بعد انسان کے اندر ندامت (repentance) کا شدید جذبہ پیدا ہو۔ وہ دوبارہ اللہ کی طرف رجوع کرے۔ وہ اپنی غلطی کا سچا اعتراف کرکے اللہ سے معافی کا طالب ہو۔ یہی وہ انسان ہے جس کو ابدی جنت میں داخلہ ملے گا۔

مغفرتِ خداوندی

سورہ الزمر کی ایک آیت ہے، جس کے بارے میں صحابی عبد اللہ ابن عمر نے کہا: هذه أرجى آية في القرآن (تفسير القرطبي)۔ یعنی یہ قرآن کی سب سے زیادہ پر امید آیت ہے۔ قرآن کی وہ آیت یہ ہے: قُلْ يَاعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (39:53)۔ یعنی کہو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

اپنے آپ پر زیادتی (to commit excesses against one’s own soul) ایک عام لفظ ہے۔ اس میں ہر قسم کی غلطیاں شامل ہیں۔ حدیث میں آیا ہے: كل بني آدم خطاء (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4251)۔ مگر اسی کے ساتھ انسان کے اندر ضمیر (conscience) ہے۔ انسان اپنی خواہش کے تحت غلطی کرتا ہے، لیکن اس کے بعد اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ اور اس کو شدت کے ساتھ ملامت کرتا ہے کہ اب تمھارا انجام کیا ہوگا۔

یہ احساسِ خطا اکثر آدمی کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے۔ مگر یہ آیت بتاتی ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ غلطی کے ارتکاب کے بعد مایوسی کے بجائے اللہ کے سامنے مغفرت کا طالب بنے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دعا کرے، اور اللہ کی طرف زیادہ سے زیادہ رجوع کرے۔

طلبِ مغفرت کوئی سادہ بات نہیں، یہ ایک نفسیاتی طوفان کا معاملہ ہے۔ طلبِ مغفرت آدمی کی روحانیت کو جگاتی ہے۔ طلبِ مغفرت سے آدمی کی معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر شخصیت کے ارتقاء (personality development) کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ یہ عمل (process) اگر بھر پور طور پر جاری رہے تو اس کا نتیجہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے سیئات حسنات میں بدل جاتے ہیں (الفرقان: 70)۔

مشیر کی اہمیت

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: إذا أراد اللہ بالأمیر خیرا جعل لہ وزیر صدق، إن نسي ذکرہ، وإن ذکر أعانہ، وإذا أراد اللہ بہ غیر ذلك جعل لہ وزیر سوء، إن نسي لم یذکرہ، وإن ذکر لم یعنہ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2932) یعنی اللہ جب کسی حاکم کے ساتھ خیر چاہتا ہے تو اس کو ایک سچا وزیر دے دیتا ہے، اگر حاکم بھولے تو وہ اس کو یاد دلائے، اور جب وہ یاد دلائے تو وہ اس کی مدد کرے۔ اور جب اللہ کسی حاکم کے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کرتا ہے تو وہ اس کو ایک برا وزیر دے دیتا ہے، اگر حاکم بھولے تو وہ اس کو یاد نہ دلائے، اور اگر وہ یاد دلائے تو وہ اس کی مدد نہ کرے۔

اس حدیث میں حاکم اور وزیر کی مثال کے ذریعے مشیر کی اہمیت کو بتایا گیا ہے۔ ہر انسان کے ساتھ رسمی یا غیر رسمی طور پر کچھ دوست اور مشیر ہوتے ہیں۔ یہ مشیر اگر سچے ہیں تو وہ ہمیشہ خیر خواہی والا مشورہ دیں گے، اور اگر مشیر سچے نہیں ہیں تو وہ ایسے مشورہ دیں گے جن سے آدمی کا کوئی بھلا ہونے والا نہیں۔ لیکن یہ معاملہ یک طرفہ نہیں ہے، بلکہ دو طرفہ ہے۔ دوست یا مشیر کا سچا ہونا یا سچا نہ ہونا، اس کا تعلق پچاس فیصد خود آدمی سے ہے۔ آدمی اگر خوشامد پسند ہو تو اس کے ارد گرد جھوٹے دوست اور جھوٹے مشیر جمع ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس، اگر آدمی حقیقت پسند ہو تو اس کے دوست اور مشیر بھی سنجیدہ اور حقیقت پسند ہوں گے۔

آدمی کی یہ ضرورت ہے کہ اس کے پاس سچے دوست اور سچے مشیر ہوں۔ ایسے لوگ آدمی کی طاقت ہیں۔ وہ اس کو خیر کا مشورہ دیں گے، شر سے بچائیں گے۔ لیکن یہ آدمی کے اپنے اوپر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کے لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اس معاملے میں وہ نہایت باشعور ہو تاکہ اس کے ارد گرد صرف خیر پسند افراد اکٹھا ہوں۔ اس معاملے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ آدمی کے اندر تنقید کو سننے کا مزاج ہو، وہ انسان کی قدر کرنا جانتا ہو۔ وہ خوشامد سے خوش ہونے والا، اور تنقید کو برا ماننے والا نہ ہو۔ جس آدمی کے اندر یہ صفت ہو، اس کے گرد یقیناً اچھے لوگ جمع ہوں گے۔

مقصد شریعت

اسلام کا مقتضیٰ صرف دو ہے۔ داخلی طور پر یہ کہ ہر مسلم تقویٰ کی زندگی اختیار کرے۔ خارجی طور پر اہل اسلام کا مشن، دعوت الی اللہ ہے۔ یعنی اللہ کے پیغامِ رحمت کو پر امن انداز میں تمام انسانوں تک پہنچانا۔ اس معاملے میں سیاسی اقتدار کا اصل رول سماج میں موافق حالات قائم کرنا ہے۔ اور امت کے افراد اور امت کے اداروں کا رول یہ ہے کہ وہ پر امن منصوبہ بندی کے ذریعے ساری دنیا میں دعوت واشاعت کا وہ کام انجام دیں جو پیغمبروں نے اپنے زمانے میں انجام دیا تھا۔

دین کے اس تصور کی روشنی میں جو نقشہ بنتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر مومن اپنے آپ کو دین حق سے باخبر کرے۔ اس بات کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: طلب العلم فریضة علی کل مسلم (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 224)۔ یعنی ہر مومن کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو دینی اعتبار سے ایک تیار ذہن (prepared mind) بنائے۔ جہاں تک سیاسی اقتدار کا تعلق ہے، اس کا کام شریعت کی تنفیذ (enforcement of Shariah) نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ جو اہل ایمان شریعتِ اسلامی کے پیرو (follower) بننا چاہتے ہیں، ان کے لیے موافق حالات فراہم کرنا۔ تاکہ وہ کسی غیر ضروری رکاوٹ کے بغیر دین کے تقاضوں کو پورا کرسکیں۔

قرآن وحدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکومت کی تخت پر غیر مسلم حکمراں ہو۔ اور وہ مذکورہ معنوں میں اہل اسلام کے لیے موید (supporter) بن سکتا ہو تو غیر مسلم حکمراں بھی اہل ایمان کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔ اسی اصول کے تحت یوسف علیہ السلام نے اپنے زمانے کے غیر مسلم حکمراں کو قبول کیا تھا۔ اور اسی اصول کے مطابق مکی دور میں کچھ صحابہ نے حبش کے غیر مسلم حکمراں کو قبول کیا تھا۔ جب کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر مکہ سے ہجرت کرکے حبش گیے اور وہاں دس سال سے زیادہ عرصے تک مقیم رہے۔ موجودہ زمانے کی سیکولر حکومت بھی عین اسی تصور کے مطابق ہے۔ اس لیے موجودہ زمانے کی سیکولر حکومت بھی مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

قرآن ایمپائر

قدیم زمانہ مواقع (opportunities) کی مونا پلی (monopoly) کا زمانہ تھا۔ اس لیے قدیم زمانے میں صرف ایک ہی قسم کا ایمپائر بن سکتا تھا۔ اور وہ پولیٹکل ایمپائر تھا۔ قدیم زمانے میں جتنے ایمپائر بنے وہ سب کے سب سیاسی ایمپائر تھے۔ موجودہ زمانہ خاتمۂ اجارہ داری (de-monopolization) کا زمانہ ہے۔ اس سے سارے مواقع ہر ایک کے لیے کھل گیے۔ اس بنا پر یہ ممکن ہو گیا کہ کوئی بھی شخص یا گروپ خالص پر امن طریقۂ کار کے ذریعے اپنا ایمپائر کھڑا کر سکے۔

اس نئے امکان کو ابھی تک زیادہ تر سیکولر لوگوں نے استعمال کیا ہے۔ نئے مواقع سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اپنے اپنے ایمپائر بنا لیے ہیں۔ مثلا ایجوکیشنل ایمپائر، انڈسٹریل ایمپائر، انسٹی ٹیوشنل ایمپائر (institutional empire)، وغیرہ۔

مگر مذہب کے معاملے میں اس امکان کو استعمال کرنے کا میدان ابھی تک خالی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذہب کے میدان میں اس امکان کو استعمال کرنے کا سب سے بڑا میدان یہ ہے کہ قرآن ایمپائر بنایا جائے۔ امکان (potential) کے اعتبار سے قرآن ایمپائر آج بھی موجود ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اس امکان کو عمل کی صورت میں کھڑا کیا جائے۔

پولیٹکل ایمپائر کے لیے ضرورت ہوتی تھی کہ بہت سے ملکوں میں ایک بادشاہ کی حکومت قائم ہو۔ مگر موجودہ زمانے میں قرآن ایمپائر بنانے کے لیے کسی بڑے زمینی رقبے کی ضرورت نہیں، آج چھوٹے زمینی رقبہ میں بھی قرآن ایمپائر بنایا جا سکتا ہے۔

موجودہ زمانے میں کمیونی کیشن (communication) اور دوسرے عالمی وسائل نے ٹکنالوجی کو ہر دوسری چیز کا بدل بنا دیا ہے۔ آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ایک چھوٹے مرکز کو جدید وسائل کے استعمال سے عالمی سطح کا قرآن ایمپائر بنا دیا جائے۔ قرآن کا مختلف زبان میں ترجمہ خود اتنا بڑا کام ہے کہ اس کی بنیاد پر ایک اعلی درجے کا قرآن ایمپائر کھڑا کیا جا سکے۔

نصرت کا قانون

سورہ یوسف قرآن کی 12 ویں سورہ ہے۔ پوری سورہ میں حضرت یوسف کا قصہ بیان ہوا ہے۔ سورہ کے خاتمہ پر قرآن میں دو آیتیں آئی ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے: یہاں تک کہ جب پیغمبر مایوس ہوگئے اور وہ خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کو ہماری مدد آ پہنچی۔ پس نجات ملی جس کو ہم نے چاہا اور مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب ٹالا نہیں جاسکتا۔ ان کے قصوں میں سمجھ دار لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔ یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں، بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی۔ اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے۔

حضرت یوسف اللہ کے ایک پیغمبر تھے لیکن ان کے ساتھ بہت انوکھے واقعات پیش آئے۔ وہ ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کی معاش تھی بکریاں پالنا، ان کو چرانا اور ان کے دودھ پر گزارا کرنا۔ پھر ان کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ خود ان کے بھائیوں نے ان کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا۔ وہ کنویں میں کچھ دن بے یار و مددگار پڑے رہے۔ پھر ایک قافلہ نے ان کو کنویں سے نکالا اور مصر لے جا کر وہاں کے بازار میں ان کو بیچ دیا۔ اس کے بعد وہ غلام بن کر ایک گھر میں رہے۔ وہاں ان پر ایک الزام لگایا گیا۔ پھر وہ جیل میں ڈال دئے گئے جس میں وہ کئی سال تک رہے۔ ان تمام سخت مراحل کے بعد وہ وقت آیا جب کہ ان پر اللہ کی نصرت آئی۔

حضرت یوسف کو کبھی جنگ وقتال کا مرحلہ پیش نہیں آیا۔ ان پر جو سختیاں گزریں وہ سب غیر جنگی حالات میں گزریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورہ کے آخر میں نصرت سے پہلے جن سخت حالات کا ذکر ہے ان کا تعلق جنگ وقتال سے نہیں ہے بلکہ عام حالات میں پیش آنے والے واقعات سے ہے۔ یہ واقعات ہر سچے انسان کی زندگی میں مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ یہ دراصل اس لئے ہے کہ انسان اللہ کی نصرت کا آخذ (recipient) بنے۔ مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آدمی کا کیس سچائی کا کیس ہے تو اس کو ضرور اللہ کی مدد آتی ہے۔ خواہ وہ مایوسی کی سطح پر پہنچنے کے بعد آئے۔

بیماری کا مثبت پہلو

بیماری بظاہر ایک غیر مطلوب چیز ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ غور کیا جائے تو بیماری میں بھی ایک عظیم مثبت پہلو موجود ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مریض کی عیادت کرنے کے لیے اس کے گھر جاتے تو آپ بیمار سے کہتے: لا بأسَ، طَهور إن شاءالله۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5656)۔ یعنی کوئی حرج نہیں، یہ پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔

محدث ابن حجر نے اس حدیث کی بابت لکھا ہے: إن شاءالله يدل على أن قوله طهور، دعاء لا خبر- یعنی یہاں ان شاء اللہ کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ کا یہ قول خبر نہیں ہے بلکہ وہ دعاء ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ قول دعاء کی صورت میں ایک خبر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیمار کے اندر مثبت سوچ پیدا ہو، بیماری کے باوجود وہ مایوس نہ ہو۔ اس دعاء میں انسان کے لیے تسکین کا ایک پہلو موجود ہے۔ اس لیے کہ بیماری کے بعد اکثر انسان کو شفا حاصل ہوتی ہے (26:80)۔ اس طرح بیماری کے واقعے میں یہ سبق پایا جاتا ہے کہ اس دنیا کا نظام بازیابی (recovery) کے اصول پر بنا ہے۔ یہاں کا اصول یہ ہے کہ کسی درخت کی ایک شاخ ٹوٹ جائے تو وہاں دوبارہ ایک نئی شاخ نکل آئے۔ انسان کو کوئی بیماری لاحق ہو تو اس کے بعد قانونِ فطرت کے مطابق وہ دوبارہ صحت مند ہو جائے۔ اس طرح اس دنیا میں کسی چیز کو کھونے کے بعد اس کو پانا (regaining of something lost) کا معاملہ ہے۔

نقصان کے بعد تلافی یا بازیابی کا یہ اصول ہر قسم کے نقصان پر صادق آتا ہے، مالی نقصان، سیاسی نقصان، وغیرہ۔ اس بنا پر انسان کے لیے اس دنیا میں کسی بھی حال میں شکایت کا موقع نہیں (no place for complaint)۔ انسان کے لیے اس قانون کی اہمیت بہت زیادہ تھی، اس لیے انسان کے لیے اس معاملے کو بیماری یا حادثہ وغیرہ کی صورت میں ذاتی تجربہ (personal experience) کی حیثیت دے دی گئی۔

تلافی مافات کے اس اصول کا تعلق جس طرح فرد کے لیے ہے، اسی طرح وہ قوم کے لیے بھی ہے۔ ایک قوم زوال کا شکار ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہوسکتی ہے۔ ایک تہذیب ختم ہوجائے تو اس کے بعد دوبارہ اس کا احیاء (revival) کیا جاسکتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ آدمی بیماری میں مبتلا ہو، پھر وہ عیادت کرنے والوں کے سامنے اس کا شکوہ نہ کرے تو اس کے لیے جنت لکھ دی جاتی ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 8801)

عیادت کرنے والوں سے شکایت نہ کرنے پر جنت ملنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو آدمی شکایت نہ کرے تو اس کو اپنے آپ جنت حاصل ہوجائے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر شکایتی نفسیات سے گہری سوچ پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کے مطابق اس کے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی اس قابل ہوجاتا ہے کہ اس کو جنت کا مستحق قرار دیا جائے۔

کسی نقصان پر اس کی تلافی کا اصول ایک اہم فطری اصول ہے۔ مستحق شخص کو یہ تلافی لازماً حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو چیز کھوئی گئی ہے وہی چیز اس کو دوبارہ مل جائے۔ یہ تلافی اکثر کسی متبادل صورت میں حاصل ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اس متبادل تلافی کو پہچانے۔ مثلاً یہ ہوسکتا ہے کہ اس کا نقصان تو مالی نوعیت کا ہو، لیکن تلافی کے طور پر اس کو جو چیز ملے وہ نفسیاتی ہو۔ یعنی سبق کی صورت میں یا ذہنی ارتقا کی صورت میں، یا روحانی ترقی کی صورت میں۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ نقصان تو دنیا میں ہو لیکن اس کی تلافی آخرت میں کی جائے۔

انسان کا تمام معاملہ سوچ پر مبنی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کبھی ردعمل (reaction) کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو۔ بلکہ جب بھی کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیش آئے تو وہ معتدل ذہن کے ساتھ اس پر غور کرے۔ وہ منفی واقعہ میں مثبت واقعہ کو دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کو قانونِ فطرت کی تائید حاصل ہوگی۔ وہ منفی واقعہ میں مثبت پہلو کو دریافت کرلے گا۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو مایوسی سے بچانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مایوسی ایک غیر فطری چیز ہے، وہ کوئی فطری چیز نہیں۔

شیطان سے بچیے

شیطان کس طرح انسان کو بہکاتا ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی معمولی بات کو زیادہ بڑھا چڑھا کر انسان کو دکھانا۔ نظر انداز کرنے والی بات کو اس طرح سنگین صورت میں پیش کرنا کہ انسان کو غصہ آجائے، اور وہ ایسا کام کرنے لگے جو اس کو نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی ایک مثال خلیفۂ دوم عمر بن خطاب کا واقعہ ہے۔ عمر بن خطاب بلا شبہ ایک عادل خلیفہ تھے۔ لیکن مدینہ کے ایک شخص ابولولو فیروز کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک معمولی واقعہ تھا، مگر شیطان نے ابولولو کو اتنا زیادہ بھڑکایا کہ اس نے سازش کرکے عمر بن خطاب کو قتل کردیا۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اس معاملے میں بے حد چوکنا رہے۔ جب بھی کوئی منفی بات اس کے ذہن میں آئے تو وہ اس کو شیطان کی بات سمجھے۔ وہ ایسی بات کو فوراً اپنے ذہن سے نکال دے۔ وہ اس بات کا تجزیہ کرکے اس کو اپنے ذہن میں غیر موثر بنادے۔

ہر عورت اور مرد کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اتنا ہوش مند بنے کہ شیطان اس کو بہکانا چاہے لیکن وہ اس کو بہکانے میں کامیاب نہ ہو۔ اس معاملے میں قرآن کی ایک متعلق آیت کا ترجمہ یہ ہے: جو لوگ ڈر رکھتے ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ (الاعراف:201)

موجودہ دنیا میں کوئی شخص، نفس اور شیطان کے حملوں سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ایسے موقع پر جو چیز آدمی کو بچاتی ہے وہ صرف اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کو بے حد حساس بنادیتا ہے۔ یہی حساسیت موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ڈھال ہے۔ جب بھی آدمی کے اندر کوئی غلط خیال آتا ہے یا کسی قسم کی منفی نفسیات ابھرتی ہے تو اس کی حساسیت فوراً اس کو بتادیتی ہے کہ وہ پھسل گیا ہے۔ ایک لمحہ کی غفلت کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے، اور وہ اللہ سے معافی مانگتے ہوئے دوبارہ اپنے کو درست کرلیتا ہے — حساسیت آدمی کی سب سے بڑی محافظ ہے، جب کہ بے حسی آدمی کو شیطان کے مقابلے میں غیر محفوظ بنادیتی ہے۔

اذیت پر صبر

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ مسند احمد کے الفاظ یہ ہیں: عن ابن عمر، عن النبي صلى الله عليه وسلم: "المؤمن الذي يخالط الناس، ويصبر على أذاهم، أعظم أجرا من الذي لا يخالطهم، ولا يصبر على أذاهم"۔ قال: حجاج: "خير من الذي لا يخالطهم" (حدیث نمبر 5022)۔ یعنی عبد اللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ مومن جو لوگوں سے مخالطت کرتا ہے، اور ان کی اذیت پر صبر کرتا ہے، وہ اجر میں اس سے زیادہ ہے جو مخالطت نہیں کرتا، اور لوگوں کی اذیت پر صبر نہیں کرتا۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں، وہ بہتر ہے ان سے جو لوگوں سے مخالطت نہ کرے۔

مخالطت کا مطلب ملنا جلنا (social intercourse) ہے۔ جو شخص اپنے آپ میں جینے والا ہو، اس کو لوگوں کی طرف سے کوئی اذیت نہیں پیش آئے گی۔ لیکن جو شخص لوگوں کے درمیان رہے، لوگوں کے ساتھ اس کا انٹرایکشن ہوتا ہو، لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات پیش آئیں، ایسے آدمی کو فطری طور پر دوسروں کی طرف سے چھوٹی یا بڑی اذیت پیش آئے گی۔ تنہائی کی زندگی گزارنے والے کے مقابلے میں مخالطت کی زندگی گزارنے والا افضل کیوں ہوتا ہے۔

اس کا سبب فطرت کا ایک اصول ہے۔ فطری نظام کے تحت ہر آدمی بے پناہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ صلاحیتیں اس کے اندر بالقوۃ (potential) کے طور پر ہوتی ہیں۔ اس بالقوۃ کو بالفعل (actual) بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کو شاک کا تجربہ پیش آئے۔ فطرت کا نظام شاکنگ ٹریٹمنٹ (shocking treatment) کے اصول پر قائم ہے۔ جو آدمی شاک کو سہے، اس کے فطری امکانات ان فولڈ (unfold) ہوتے رہتے ہیں، اس کا ذہنی ارتقا (intellectual development) ہوتا رہے گا۔ اس کے برعکس، جو شخص صدمہ (shock) کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو، تو اس کے اندر ذہنی ارتقا کا عمل جاری نہیں ہوگا۔ وہ جیسا پیدا ہوا تھا، ویسے ہی مر جائے گا۔

جامع نصیحت

ایک صاحب نے کہا کہ آپ مجھ کو ایک جامع نصیحت کیجیے، جس کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح سے ہو۔ میں نے کہا کہ قرآن کی روشنی میں میرا جواب یہ ہے کہ صبر کا طریقہ اختیار کیجیے۔ اور پھر آپ اللہ کی توفیق سے دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک مستقل خدائی گائڈ موجود ہے۔ یہ انسان کا ضمیر (conscience) ہے۔ انسان کا ضمیر ایک بے خطا رہنما ہے۔ وہ ہمیشہ انسان کو صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ انسان کے اندر مختلف قسم کی خواہشیں (desires) ہیں۔ قرآن میں ضمیر کو نفس لوامہ کہا گیا ہے، اور خواہشوں کو نفس امارہ۔

انسان کا ضمیر ہر موقعہ پر اس کو صحیح رہنمائی دیتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی خواہشیں انسان کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہیں۔ اس طرح ضمیر اور خواہش کے درمیان ایک ٹکراؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس ٹکراؤ میں اکثر خواہش غالب آتی ہے اور انسان ضمیر کی آواز کو نظر انداز کرکے خواہش کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ یہ واقعہ دنیا کے معاملات میں بھی پیش آتا ہے اور آخرت کے معاملات میں بھی۔

اس نازک وقت میں جو چیز انسان کے کام آتی ہے، وہ صبر ہے۔ انسان اگر صبر کا ثبوت دے تو وہ اپنی خواہشات پر کنٹرول کرے گا۔ اس طرح وہ اس میں کامیاب ہوجائے گا کہ وہ صراطِ مستقیم سے انحراف (deviate) نہ کرے۔ اور ضمیر کی آواز پر چلتے ہوئے، اپنا سفر صحیح سمت میں جاری رکھے۔ یہاں تک کہ وہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائے۔ اسی لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صبر پر انسان کو سب سے زیادہ انعام دیا جاتا ہے (الزمر: 10)۔

عملی اعتبار سے زندگی میں سلبی صفت کی اہمیت ایجابی صفت سے بھی زیادہ ہے۔ جو آدمی صرف کرنا جانے اور رکنا نہ جانے، وہ کبھی اپنی زندگی میں اعلیٰ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ زندگی کا معاملہ موٹر کار کے معاملہ جیسا ہے۔ موٹر کار میں اگر بریک نہ ہو تو خواہ موٹر کار کتنی ہی اچھی ہو، وہ منزل پر نہیں پہنچ سکتی۔ موٹر کار میں جو اہمیت بریک کی ہے، وہی اہمیت زندگی میں صبر کی ہے۔

زوال کی علامت

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: لَتُنْقَضَنَّ عُرى الإسلام عُروة عروة، فكلما انتقضت عروة تَشبّث الناس بالتي تليها، وأولهن نقضا الْحُكْمُ وآخرهن الصلاة۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 22160) یعنی اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے توڑ دی جائیں گی۔ جب بھی کوئی ایک کڑی ٹوٹے گی تو لوگ اس کے بعد والی کڑی سے چمٹ جائیں گے، اور ان کڑیوں میں سے پہلی کڑی جو ٹوٹے گی وہ حُکم ہوگا، اور آخری کڑی جو ٹوٹے گی وہ نماز ہوگی۔

اس حدیث میں ایک تمثیل کے ذریعے امت کے زوال کی حالت بتائی گئی ہے۔ زوال کا آغاز حُکم کے خاتمے سے ہوتا ہے۔ حُکم کا مطلب حکمت (wisdom) ہے۔ یہاں حکمت کا لفظ عام معنی میں نہیں بلکہ دینی معنی میں ہے۔ یعنی امت کے افراد میں حکمتِ دنیا تو باقی رہتی ہے لیکن حکمتِ دینی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ نماز سے مراد، نماز کی صورت (form) نہیں بلکہ نماز کی اسپرٹ ہے۔ زوال کے زمانے میں لوگ بظاہر نماز کا اہتمام تو کرتے ہیں لیکن عملاً وہ فارم کی نماز ہوتی ہے نہ کہ اسپرٹ کی نماز۔

حکم اور صلاۃ دونوں کے خاتمے کا سبب ایک ہوتا ہے۔ اور وہ ہے دین کی حقیقت گم ہوجانا، اور اس کا صرف کلچر کی سطح پر باقی رہنا۔ حکم سے مراد دین کی سمجھ ہے۔ زوال کے زمانے میں یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کا تعلق زیادہ سے زیادہ اپنے دنیوی معاملات سے ہوجاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں فطری طور پر یہ ہوتا ہے دین کے بارے میں لوگوں کی حساسیت پہلے کم ہوتی ہے اور پھر ختم ہوجاتی ہے۔ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنے دنیوی معاملات میں مشغول رہتے ہیں۔ اس مشغولیت کے بنا پر عملا یہ ہوتا ہے کہ دین کی حساسیت صرف وہ لوگ زندہ رکھ پاتے ہیں جو عملی مشغولیت کے باوجود فکری طور پر بیدار رہوں اور بالقصد سوچ کی سطح پر دین کی اسپرٹ کو باقی رکھیں۔ اس کے برعکس اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر سے دین کی سمجھ ختم ہوجاتی ہے، اور لوگ بے روح فارم کو دین سمجھ لیتے ہیں۔

فتووں کی شریعت

پرنٹنگ پریس 1440 ءمیں ایجاد ہوا۔ اس کا موجد جرمنی کا گوٹن برگ (Johannes Gutenberg) ہے۔مسلم دنیا میں پرنٹنگ پریس زیادہ دیر میں عام ہوا۔ 1727ء میں ترکی میں ابراہیم متفرقہ نے پرنٹنگ پریس قائم کیا۔ پریس کا قیام کوئی معمولی واقعہ نہ تھا..... (مگر اس وقت کے) بااقتدار علماء نے اسے ''بدعت'' تصور کیا، شیخ الاسلام نے فتوی دیا کہ (اس پر) مذہبی کتابوں کا چھاپنا شرعاً ممنوع ہے۔(اشخاص وافکار، ضیاء الحسن فاروقی، ص16—17، این سی پی یو ایل، نئی دہلی، 2011)۔

حرمت کے فتووں کا رواج اصحابِ رسول کے زمانے میں موجود نہ تھا۔ بعد کے زمانے میں جب امت میں زوال آیا تو علماء تقلید کی روش پر قائم ہو چکے تھے۔ وہ ہرنئی چیز کو توحش کی نظر سے دیکھنے لگے۔ وہ ہرنئی چیز کو شریعت کے خلاف سمجھنے لگے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ حرمت کے فتووں کا رواج عام ہوا۔ بدقسمتی سے یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

''حرمت کی شریعت'' کے اس رواج کا سبب کیا ہے۔اس کا سبب زمانے سے بے خبری (unawareness) ہے۔ بعد کے زمانے میں علماء اپنے وقت کی علمی ترقیوں سے بے خبر ہوگیے۔ اس بنا پر وہ ہرنئی چیز کو غلط سمجھنے لگے۔اگر یہ علماء جدید حالات سے واقف ہوں، اگر وہ وقت کے علمی معیار پر نئے مسائل کا سامنا کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں تو وہ نئے حالات کا مطالعہ کریں گے۔ وہ علمی انداز میں اس کا تجزیہ کریں گے۔ اور پھر وقت کی علمی سطح پر اس کی نوعیت کو بیان کریں گے۔ وہ تکفیر کی زبان استعمال کرنے کے بجائے علمی تجزیہ کی زبان استعمال کریں گے۔ بلکہ وہ نئے پیدا شدہ حالات کو اپنے ذہنی ارتقا کے لیے فکری خوراک بنالیں گے۔مگر بدقسمتی سے بعد کے زمانے کے مسلم علماء اس اہلیت کا ثبوت نہ دے سکے۔ ہر چیز جو ان کی سمجھ میں نہیں آئی، اس پر وہ منفی ردعمل کا اظہار کرنے لگے۔ یہ ذہنی جمود کی حالت ہے۔اور ذہنی جمود کی حالت اسلام میں مطلوب نہیں۔

داعی کا اخلاق

مشہور صحابی انس بن مالک کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے: شج النبي صلى الله عليه وسلم يوم أحد، فقال: ”كيف يفلح قوم شجوا نبيهم؟“. فنزلت: ليس لك من الأمر شيء۔ (صحیح مسلم حدیث نمبر 1791)۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ غزوۂ احد کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگیے۔ اس وقت آپ نے فرمایا: وہ قوم کیسے فلاح پائے گی، جو اپنے نبی کو زخمی کرے۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری، تم کو اس معاملے میں کوئی دخل نہیں۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کا اخلاق کیا ہونا چاہیے۔ داعی کو چاہیے کہ وہ یکطرفہ اخلاقیات کا طریقہ اختیار کرے۔ یعنی مدعو کے سلوک پر کوئی شکایت نہ کرنا۔ شکایت اور احتجاج سے پوری طرح اوپر اٹھ جانا، ہر حال میں ردعمل کی نفسیات سے کامل طور پر پاک ہونا۔

داعی اپنے مدعو کا مکمل طور پر خیر خواہ ہوتا ہے۔ یہی خیر خواہی کی اسپرٹ داعی کے اندر وہ اخلاقیات پیدا کرتی ہے جو داعی کو کامل طور پر ایک بے شکایت انسان بنا دیتی ہے۔ داعی کے اندر یک طرفہ اخلاقیات کی یہ صفت لازمی طور پر ضروری ہے۔ داعی اگر اس کردار کا حامل نہ ہو تو وہ کبھی دعوت الی اللہ کا کام نہیں کرسکتا۔

دعوت سے مراد دعوت الی اللہ ہے۔ داعی اپنا دعوتی کام اللہ کے لیے کرتا ہے۔ وہ اپنے عمل کے لیے اللہ سے اجر کی امید رکھتا ہے۔ مدعو کا رویہ خواہ کچھ ہو، داعی ہر تجربے کو اللہ کی نسبت سے دیکھتا ہے۔ داعی کے اندر اگر ردعمل کا مزاج پیدا ہوجائے، وہ اپنے مدعو سے ٹکراؤ شروع کردے تو اس کی دعوت، وہ دعوت نہ ہوگی جو اللہ کو مطلوب ہے۔ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ دعوت کے ذریعے انسان کے اوپر حجت تمام ہو۔ اس کو یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ ہم بے خبر تھے۔ داعی کے اندر یکطرفہ اخلاقیات کا مقصد یہ ہے کہ مدعو کے لیے کسی قسم کا عذر باقی نہ رہے، مدعو کے ساتھ آخرت میں جو معاملہ کیا جائے وہ ہر اعتبار سے ایک جائز معاملہ ہو۔

غلطی کے بعد

غلطی کرنے کے بعد اکثر لوگ دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ غلطی کی صفائی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ غلطی کرنے کے بعد یہ دریافت کیا جائے کہ غلطی کیوں ہوئی۔ غلطی کی صفائی پیش کرنے والے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جہاں وہ پہلے تھا، وہیں وہ بعد کو بھی باقی رہتا ہے۔ اس کے برعکس، غلطی کا سبب دریافت کرنے والے کو یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی غلطی کو دوبارہ دہرانے سے بچ جاتا ہے۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: عن أنس، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم: کل بني آدم خطاء، و خیر الخطائین التوابون (ابن ماجہ، حدیث نمبر 4251)۔ یعنی ہر انسان غلطی کرنے والا ہے، اور سب سے اچھا غلطی کرنے والا وہ ہے جو غلطی کے بعد توبہ کرے۔

اصل یہ ہے کہ کسی انسان کے پاس کلی علم نہیں۔ اس بنا پر انسان ہمیشہ غلط رائے قائم کرتا ہے۔ اس کے منصوبہ میں ہمیشہ غلطیاں ہوتی ہیں۔ انسان کی خوبی یہ نہیں ہے کہ وہ کبھی غلطی نہ کرے۔ انسان کی خوبی یہ ہے کہ کسی وجہ سے غلطی کرنے کے بعد جب اس پر اپنی غلطی ظاہر ہوجائے تو وہ فوراً رجوع کرے، وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے، اپنے عمل کو مطابقِ حقیقت بنائے۔ وہ کھلے طور پر اعتراف کرے کہ اس سے پہلے اس سے غلطی ہوگئی تھی۔ اب وہ اپنی رائے کو بدلتا ہے، اور زیادہ درست انداز میں اپنے کام کا نقشہ بناتا ہے۔

جو آدمی اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرے، اس کی قیمت اس کو یہ دینی پڑے گی کہ وہ بدستور اپنی غلط روش پر قائم رہے۔ اس طرح وہ ایک طرف یقین سے محروم ہوجائے گا۔ کیوں کہ ایک بات کو درست نہ سمجھتے ہوئے وہ اس پر قائم رہے گا۔ دوسرا نقصان یہ ہوگا کہ اس کا عمل نتیجہ خیز ثابت نہ ہوگا، اس کا منصوبہ مطلوب نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوگا۔

اصل مسئلہ

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ کوئی خارجی سازش نہیں۔ ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ دورِ حاضر سے بے خبر ہوگیے ہیں۔ مسلمان یہ سوچتے ہیں کہ دورِ حاضر ان کے لیے مسائل کا دور (age of problems) ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ موجودہ زمانہ مسلمانوں کے لیے مواقع کا زمانہ (age of opportunities) ہے۔

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وعلى العاقل أن يكون بصيرًا بزمانه (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361)۔ یعنی دانش مند کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے سے باخبر ہو۔ آدمی جب اپنے زمانے سے باخبر ہو تو وہ اپنے عمل کی صحیح منصوبہ بندی کرے گا۔ اور اگر وہ زمانے سے بے خبر ہوجائے تو اس کی سوچ بھی غلط ہوجائے گی، اور اس کی منصوبہ بندی بھی غلط۔

اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں کا خیال ہے کہ امریکا اسلام دشمن ہے۔ اس نظریہ کو عام طور پر اسلاموفوبیا (Islamophobia) کہا جاتا ہے۔ مگر یہ بات مکمل طور پر بے بنیاد ہے۔ کوئی بھی شخص امریکا کا سفر کرے، تو وہ پائے گا کہ وہاں کے مسلمان خوب ترقی کررہے ہیں۔ وہاں بڑی تعداد میں مسجدیں اور اسلامی سینٹر قائم ہیں۔ مذہبی اعتبار سے وہاں مسلمانوں کو کوئی بھی رکاوٹ نہیں۔ اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ خود مسلمان امریکوفوبیا (Americophobia) میں مبتلا ہیں، نہ کہ امریکا اسلاموفوبیا میں۔

موجودہ زمانے کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں متعصّبانہ فکر کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ جدید دور کا کلچر تمام تر ایک ہی اصول پر قائم ہے۔ اور وہ ہے مسابقت (competition)۔ مغربی دنیا کا فارمولا ایک لفظ میں یہ ہے: compete or perish

مسلمان اپنی روایتی سوچ کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب ان کے خلاف سازش کرتا ہے، مغرب میں ان کے خلاف تعصب کیا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں بالکل بے بنیاد ہیں۔ مسلمان صرف ایک کام کریں۔ وہ یہ ہے کہ وہ جدید تعلیم میں امتیازی درجہ حاصل کریں۔ اس کے بعد ان کو کسی سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

نفس کا شر کیا ہے

ایک حدیث رسول میں ایک دعا ان الفاظ میں آئی ہے: اللهم ألهمني رشدي، وأعذني من شر نفسي (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3483)۔ یعنی اے اللہ، مجھ کو صحیح راستے کی ہدایت دے، اور مجھ کو میرے نفس کے شر سے بچا۔ رُشد کے معنی ہیں راہ راست، یا ہدایت کا راستہ۔ یعنی وہ راستہ جس پر چل کر انسان کو دنیا اور آخرت کی فلاح حاصل ہوتی ہے۔

یہ راستہ قرآن وسنت میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے۔ ہدایت کے راستے کو جاننا اور اس پر عمل کرنا، انسان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ پھر وہ کیا چیز ہے جس کو یہاں نفس کا شر بتایا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی سچائی کو جانے لیکن غلط تاویل کر کے اس کی صورت کو بدل دے۔

غلط تاویل ہمیشہ نفس کے شر کی وجہ سے ہوتی ہے۔ غلط تاویل کی گنجائش بہت زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ ایک واضح حکم کو بھی غلط تاویل کے ذریعے کچھ سے کچھ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآن میں آیا ہے کہ نماز قائم کرو۔ اگر انسان کے اندر شر نہ ہو تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے، لیکن اگر اس کے اندر شر ہو، یعنی اس کی نیت درست نہ ہو تو وہ عجیب وغریب تاویل کر کے اس کا مفہوم کچھ سے کچھ بنا دے گا۔ مثلاً اقامت صلاۃ کا مطلب ہے اقامت نظام، اقامت صلاۃ کا مطلب ہے سماج میں سدھار لانا، اقامت صلاۃ کا مطلب وہی چیز ہے جس کو اس زمانے میں سوشل سروس کہا جاتا ہے، وغیرہ۔ نفس کے شر سے بچنا آدمی کا اپنا کام ہے۔ صرف دعا کے الفاظ بولنے سے آدمی نفس کے شر سے بچ نہیں سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس معاملے میں پچاس فیصد آدمی کا اپنا کام ہے، اور بقیہ پچاس فیصد دعا کا کام ہے۔ اس معاملے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی صدق نیت کے ساتھ راہ راست کو دریافت کرے۔ اس کے اندر اس پر عمل کرنے کا سچا جذبہ موجود ہو۔ پھر وہ اللہ سے اس پر استقامت کی دعا کرے۔ وہ اللہ سے اس بات کی مدد مانگے کہ شیطان اس پر حاوی نہ ہو جائے۔ وہ شیطان کی تزئین اور اس کے وسوسہ کو پہچانے، اور اپنے آپ کو اس سے بچائے۔

والرُجز فاهجر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن توحید کا مشن تھا۔ آپ نے اپنا مشن 610 عیسوی میں قدیم مکہ میں شروع کیا۔ اس وقت ابتدائی دور میں آپ کے لیے قرآن میں جو ہدایات نازل ہوئیں، ان میں سے ایک یہ تھی: وَالرُّجْزَ فَاهْجُر (74:5)۔ یعنی رُجز کو چھوڑ دو۔ رجز کا لفظی مطلب گندگی (dirt) ہے۔ یہ لفظ یہاں آپ کے ذاتی کردار کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ دعوت کے طریقہ کار کے اعتبار سے ہے۔

قدیم مکہ میں رُجز کو چھوڑنے کا مطلب کیا تھا۔ اس کو پیغمبر اسلام کی عملی سیرت کی روشنی میں متعین کیا جائے تو وہ یہ ہوگا— مکہ میں اگرچہ تمھارے لیے ناموافق حالات ہیں، مگر تم اس معاملے میں حکیمانہ طریقہ اختیار کرو، اور چیزوں کو غلط زاویۂ نظر (wrong angle) سے دیکھنا چھوڑ دو۔

اس معاملے کی ایک مثال سورہ نمبر 94 میں ان الفاظ میں ملتی ہے: وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (الانشراح:4)۔ یعنی تمھارے مشن کے خلاف لوگ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں، لیکن تم اس پروپیگنڈے کو پبلسٹی (publicity) کے معنی میں لو۔ اور اس کو اپنے دعوتی مشن کے لیے ایک موقع (opportunity) کے طور پر استعمال کرو۔

اس معاملے کی ایک اور مثال یہ ہے کہ قدیم مکہ میں لوگوں نے مقدس کعبہ کے اندر تقریباً تین سو ساٹھ بت رکھ دیے تھے۔ یہ بظاہر ایک اشتعال انگیز بات تھی۔ لیکن پیغمبر اسلام اس پر مشتعل نہیں ہوئے۔ آپ نے وقتی طور پر اس کو نظر انداز کیا۔ اس کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ کعبہ میں بتوں کی موجودگی کی بنا پر وہاں ہر روز مشرکین کا جو اجتماع ہوتا تھا، اس کو اپنے لیے بطور آڈینس (audience) استعمال کیا۔ آپ خاموشی کے ساتھ وہاں جاتے اور لوگوں کو قرآن سناتے۔ روایات میں اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وعرض عليهم الإسلام، وتلا عليهم القرآن (سیرت ابن ھشام، مصر 1955، 1/428)۔

مثبت روش کا نتیجہ

اسلام کی ایک تعلیم قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:34)۔اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔قرآن کی اس آیت میں عام اجتماعی زندگی میں حسنِ اخلاق (good behaviour) کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔حسن اخلاق بلاشبہ ایک اہم اسلامی قدر (Islamic value) ہے۔لیکن قرآن کی اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وہ عداوت کی نسبت سے ہے، نہ کہ نارمل تعلقات کی نسبت سے۔

اسلام ایک مشن ہے، پرامن دعوتی مشن۔ باعتبارِ حقیقت یہ مشن پوری طرح پرامن اور غیر سیاسی مشن ہے۔لیکن کسی ماحول میں جب اس مشن کے لیے کام کیا جائے تو کچھ لوگ نظریاتی بنیاد پر اس کے خلاف ہوجاتے ہیں۔اس طرح داعی اور مدعو کے درمیان عملاً نزاع (controversy) کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ایسے موقع پر مدعو کی طرف سے داعی کی مخالفت شروع ہوجاتی ہے۔مذکورہ قرآنی تعلیم اسی طرح کی نزاعی صورتِ حال کے بارے میں ہے۔

اس طرح کی صورتِ حال میں داعی کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہرگز اپنے کلام میں منفی ردعمل (negative reaction) کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ بلکہ وہ یک طرفہ طور پر مثبت رسپانس (positive response) کی روش پر قائم رہیں۔ داعی اگر اپنے آپ کو منفی ردعمل سے بچائے، مکمل طور پر دونوں کے درمیان اعتدال کی فضا قائم رہے، تو فطرت اپنا کام کرے گی۔ فطری پراسس کے تحت مدعو کی نفسیات بدلنا شروع ہوجائے گی، یہاں تک کہ یہ واقعہ پیش آئے گا کہ جو شخص بظاہر مخالف نظر آرہا تھا، وہ داعی کا حامی اور موافق بن جائے گا۔منفی ردعمل مدعو کی ایگو (ego) کو بھڑکاتا ہے، مثبت رسپانس اس کو معتدل بنادیتا ہے۔

مشتعل نہ ہونے کا کرشمہ

کسی بات کا جواب اگر مشتعل ہو کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ منفی صورت میں نکلتا ہے۔ اور اگر آدمی سخت بات سنے مگر وہ اپنے اعتدال کو نہ کھوئے، بلکہ اشتعال کے بغیر جواب دے تو نتیجہ معجزاتی طور پر موافق صورت میں نکلے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اشتعال انگیز جواب سے سننے والے کی انا بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ غیر ضروری طور پر دشمن بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر معتدل انداز میں جواب دیا جائے تو سننے والے کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ اور گفتگو فطری انداز میں ہونے لگتی ہے۔ پیدائشی طور پر ہر آدمی آپ کا دوست ہے۔ اس کے بعد آپ کا رویہ یا تو اس کی دوستی کو باقی رکھتا ہے یا اس کو دشمن بنا دیتا ہے۔ اس نوعیت کی ایک تاریخی مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاری قبائل (Mongols) نے عباسی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر حلب تک مسلم سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے کچھ سال بعد یہ معجزاتی واقعہ ہوا کہ تاتاری قبائل کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام کے دشمن اسلام کے خادم بن گیے۔

اس تاریخی واقعہ پر پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ (Thomas Walker Arnold, [1864-1930]) نے ریسرچ کی ہے۔ ان کی کتاب دی پریچنگ آف اسلام *(The Preaching of Islam)* کے باب 'Spread of Islam among the Mongols' کے تحت اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

اس زمانے میں تاتاری لوگ مسلمانوں کو سخت حقیر سمجھنے لگے تھے۔ اس دور کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دن تاتاری شہزادہ تغلق تیمور خاں نے ایک ایرانی مسلمان، شیخ جمال الدین کو دیکھا۔ اس نے نفرت کے ساتھ کہا کہ تم اچھے یا میرا کتا اچھا۔ شیخ جمال الدین نے اس کو سن کر معتدل انداز میں جواب دیا، اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہوا تو میں اچھا۔ اور اگر میرا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوا تو تمھارا کتا اچھا۔ یہ جواب سن کر شہزادہ کا غصہ ختم ہو گیا۔ اور اس نے شیخ کے ساتھ اچھا برتاؤ شروع کر دیا۔

پروفیسر آرنلڈ نے اس واقعہ کو اپنی کتاب میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

Tūqluq Timūr Khān (1347–1363), is said to have owed his conversion to a holy man from Bukhārā, by the name Shaykh Jamāl al-Dīn. This Shaykh, in company with a number of travellers, had unwittingly trespassed on the game-preserves of the prince, who ordered them to be bound hand and foot and brought before him. In reply to his angry question, how they had dared interfere with his hunting, the Shaykh pleaded that they were strangers and were quite unaware that they were trespassing on forbidden ground. Learning that they were Persians, the prince said that a dog was worth more than a Persian. "Yes," replied the Shaykh, "if we had not the true faith, we should indeed be worse than the dogs." Struck with his reply, the Khan ordered this bold Persian to be brought before him on his return from hunting, and taking him aside asked him to explain what he meant by these words and what was "faith". The Shaykh then set before him the doctrines of Islam with such fervour and zeal that the heart of the Khān that before had been hard as a stone was melted like wax, and so terrible a picture did the holy man draw of the state of unbelief, that the prince was convinced of the blindness of his own errors, but said, "Were I now to make profession of the faith of Islam, I should not be able to lead my subjects into the true path. But bear with me a little and when I have entered into the possession of the kingdom of my forefathers, come to me again." (London, 1913, p. 235)

شیخ جمال الدین سے ملاقات کے بعد کچھ اور واقعات پیش آئے یہاں تک کہ تغلق تیمور خاں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد اس نے حکمت کے ساتھ لوگوں کو اسلام کے بارے میں بتایا۔ یہاں تک کہ تاتاریوں کی اکثریت اسلام میں داخل ہوگئی۔ شیخ جمال الدین کا مشتعل جواب تاریخ کو دوسرا رخ دے دیتا۔ لیکن ان کے معتدل جواب نے تاریخ کو صحیح رخ پر ڈال دیا۔

مواقع کا استعمال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں رہے۔ اس کے بعد آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ مدینہ کے لوگوں نے بہت جلد آپ کو اپنا قائد تسلیم کرلیا۔ اس کا راز یہ تھا کہ آپ کی ہجرت سے تقریبا پانچ سال پہلے مدینہ (یثرب) کے دو قبائل، اوس اور خزرج کے درمیان جنگ ہوئی۔ جو جنگ بعاث کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ اس سلسلے میں حضرت عائشہ کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے: کان یوم بعاث، یوما قَدمه الله لرسوله (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3777)۔ یعنی آپ کی ہجرت سے پہلے جنگ بعاث کا ہونا، یہ اللہ کی طرف سے آپ کی ایک مدد تھی۔

اس جملہ کی شرح کرتے ہوئے شارحین نے لکھا ہے: لو کان صنادیدھم أحیاء لما انقادوا لرسول الله صلی الله علیه و سلم حبا للریاسة (عمدۃ القاری للعینی، بیروت، 17/ 64۔ الکواکب الدراری فی شرح صحیح البخاری للکرمانی، بیروت، 1981، 15/ 139)۔ یعنی اگر ان کے بڑے بڑے سردار اس وقت زندہ ہوتے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہرگز اطاعت نہ کرتے، اپنی سرداری کی محبت میں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورتِ حال کو سمجھا، اور نہایت حکمت کے ساتھ اس کو استعمال کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف سرداروں کا مارا جانا کافی نہ تھا، بلکہ یہ بھی ضروری تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچنے کے بعد نہایت حکمت کا طریقہ اختیار فرمائیں۔ تاکہ کوئی نیا مسئلہ پیدا نہ ہوجائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل ایمان کے لیے موافق حالات ہمیشہ پیدا ہوتے ہیں۔ مگر صرف حالات کا پیدا ہونا کافی نہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم قائدین ان حالات کو سمجھیں، اور پیدا شدہ مواقع کو حکمت کے ساتھ استعمال (avail) کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکیمانہ طریقہ بھی اہل ایمان کے لیے ایک سنت کی حیثیت رکھتا ہے۔

بڑوں کی صحبت

ایک نوجوان انڈیا میں پیدا ہوئے۔ انڈیا میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم میں ان کو اعلیٰ درجے کی ڈگری ملی۔ پھر وہ یوروپ چلے گیے۔ اب وہ یوروپ کے ایک ترقی یافتہ شہر میں آرام و آسائش کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس نوجوان کی بہن ابھی انڈیا میں رہتی ہے۔ بھائی سے ٹیلیفون پر بہن کی بات ہوئی۔ بہن نے بے تکلفی کے انداز میں کہا کہ تم انڈیا واپس آجاؤ۔ یہ سن کر بھائی نے جواب دیا— کیا میں پاگل ہوں۔

مذکورہ بھائی ابھی جوانی کی عمر میں ہیں۔ یورپ کے شہر میں وہ اچھی صحت کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ ان کو ابھی زندگی کے گہرے مسائل کا تجربہ نہیں۔ اگر وہ جانتے کہ ان کی جوانی اور صحت ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی ایک دن بوڑھے اور ضعیف ہوجائیں گے۔ اس کے بعد زندگی ان کے لیے اسی طرح ایک بوجھ (burden) بن جائے گی جس طرح دوسرے بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لیے بن جاتی ہے تو وہ اس قسم کا جواب نہ دیتے۔ اس واقعے کو سن کر مجھے ایک حدیث رسول زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آئی۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: عن ابن عباس أن النبي صلى الله عليه و سلم قال: البرَكة مع أكابر كم (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 559)۔ یعنی برکت تمھارے اکابر کے ساتھ ہے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: الخير مع أكابر كم (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، حدیث نمبر 12618)۔ یعنی خیر تمھارے اکابر کے ساتھ ہے۔

اس حدیث میں اکابر کا لفظ پراسرار بزرگی کے معنی میں نہیں۔ بلکہ یہ لفظ زندگی کی ایک فطری حقیقت کو بتاتا ہے۔ اکابر کا لفظ یہاں معمر اشخاص (seniors) کے معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ افراد جو صحیح زندگی گزاریں اور پھر وہ زیادہ عمر تک پہنچ جائیں۔ تو فطری طور پر وہ زیادہ اہل دانش (man of wisdom) بن جاتے ہیں۔ ان کی باتیں سننے والے اور ان کے ساتھ بیٹھنے والے کو ان سے حکمت ودانائی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

معمر (senior) آدمی کو چند اضافی مواقع مل جاتے ہیں۔ اس کو موقع ملتا ہے کہ وہ زیادہ مدت تک علم سیکھے، وہ زیادہ مدت تک زندگی کا تجربہ حاصل کرے۔ اسی کے ساتھ بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے کی بنا پر اس کو زندگی کے شدائد (difficulties) کو جھیلنا پڑتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے اندر سنجیدگی اور تواضع (modesty) آجاتی ہے۔ یہ صفت اس کو زندگی کے ایسے پہلوؤں سے آگاہ کرتی ہے جس سے جوان لوگ بالکل بے خبر رہتے ہیں۔

معمر (senior) انسان اگر فطری زندگی گزارے تو اپنی عمر کے آخری حصے میں اس کے اندر ایسی دانش (wisdom) پیدا ہوجاتی ہے جو جوانی کے عمر میں آدمی کے اندر نہیں ہوتی۔ وہ ایسی بصیرت افروز باتیں کرنے لگتا ہے جس سے کم عمر انسانوں کی باتیں خالی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے انسان کی باتوں میں زیادہ خیر اور زیادہ برکت (نفع بخشی) شامل ہوجاتی ہے۔

آدمی جب پیدا ہوتا ہے اور پھر بچپن سے جوانی کی عمر تک پہنچتا ہے تو پہلے مرحلۂ حیات میں اس کو بجلی جیسی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے اندر عزم ہوتا ہے۔ وہ حوصلہ مندانہ انداز میں زندگی کی سرگرمیوں میں شریک ہوتا ہے۔ یہ حالات اس کے اندر ایک پر اعتماد شخصیت بنا دیتے ہیں۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں سب کچھ ہوں۔ میں جو چاہوں کرسکتا ہوں۔ میں اپنی مرضی کے مطابق اپنے لیے ایک زندگی کی تعمیر کرسکتا ہوں۔

مگر دھیرے دھیرے اس کی عمر بڑھتی ہے۔ وہ ایجنگ (ageing) کے دور میں داخل ہوجاتا ہے۔ اب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں پہلے جیسی طاقت نہیں رہی۔ اس کا حافظہ اس طرح کام نہیں کرتا جس طرح وہ پہلے کام کرتا تھا۔ اس کا دماغ، اور اس کی آنکھ، اور اس کے کان، اور دوسرے اعضا اگرچہ بظاہر پہلے کی طرح ہیں، لیکن ہر ایک میں کمزوری آچکی ہے۔

یہ وہ دور ہوتا ہے جب کہ انسان کے اندر ایک نئی شخصیت ابھرنے لگتی ہے۔ وہ ایک حقیقت شناس انسان بن جاتا ہے۔ پہلے اگر وہ بے احتیاطی کے فیصلے کرتا تھا تو اب وہ اپنے فیصلوں میں زیادہ محتاط بن جاتا ہے۔ یہی وہ دورِ حیات ہے جس کی طرف مذکورہ حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

آخری گیت

رتن سنگھ (پیدائش 1927) اردو کے ایک مشہور ادیب ہیں۔ ایک گفتگو کے دوران ان کے انٹرویور ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے ان سے پوچھا، آپ اپنی نمائندہ کہانی کس کہانی کو مانتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا، نمائندہ کہانی تو ابھی مجھے لکھنی ہے۔ کب سرسوتی مہربان ہوجائے، کہہ نہیں سکتا۔ (ماہنامہ اردو دنیا، دہلی، اکتوبر 2015، صفحہ 9) نوبیل انعام یافتہ رابندر ٹیگور نے اپنی کتاب گیتانجلی میں اپنے بارے میں لکھا ہے: ساری عمر بینا کے تاروں کو سلجھانے میں بیت گئی، جو انتم گیت میں گانا چاہتا تھا، وہ میں نہ گا سکا۔

یہ احساس تقریباً ہر ادیب اور صاحبِ قلم کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر آئڈلسٹ (idealist) ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے آئڈیل کو لفظوں میں ڈھال سکے، لیکن ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کا سبب ایک فطری تضاد ہے جس سے ہر انسان زندگی میں دوچار رہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فطرت سے وہ خود تو معیار پسند مزاج لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن اپنے خیال کے اظہار کے لیے اس کے پاس جو الفاظ ہوتے ہیں، وہ معیار سے کمتر ہوتے ہیں۔ اس تضاد کی بنا پر ہر باذوق انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ عملاً ایک تشنگی میں جیتا ہے، اور آخر کار اسی تشنگی میں مرجاتا ہے۔

انسان کی اس تشنگی کے پورا ہونے کا مقام صرف جنت ہے۔ یہ تشنگی اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ انسان اس پر سنجیدگی کے ساتھ سوچے، جو آدمی حقیقی معنوں میں متلاشی (seeker) بن کر اس پر غور کرے گا، وہ ضرور اس کا جواب پالے گا۔ اور پھر اس کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ وہ کس چیز کو اپنی تلاش کی منزل بنائے — انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے جنت کا طالب ہے۔ انسان طالب ہے، اور جنت اس کا مطلوب۔ انسان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو جانے، اور اس کو اپنا منزل مقصود بنائے۔

منافق کا کردار

منافقت (hypocrisy) ایک عام انسانی کردار ہے۔ منافقت یہ ہے کہ آدمی کے اندر دہرا معیار (duplicity) کا انداز پایا جاتا ہو۔ ایسا آدمی دو چہرے والا (double-faced) آدمی ہوتا ہے۔ وہ گفتگو میں اپنے آپ کو جیسا ظاہر کرتا ہے، اندر سے وہ ویسا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کو حضرت مسیح نے ''سفیدی پھری ہوئی قبروں'' سے تشبیہہ دی ہے۔ یعنی اندر سے تو وہ تاریک کردار کا آدمی ہے مگر باہر سے وہ اپنے آپ کو صاف ستھرا بنائے ہوئے ہے۔

عربی زبان میں کہا جاتا ہے کہ نافق الیربوع، یعنی جنگلی چوہا سوراخ میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک چھوٹا چوہا ہے جو اپنے آپ کو بل میں چھپائے رہتا ہے۔ یہی حال منافق انسان کا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو مصنوعی الفاظ بول کر چھپائے رہتا ہے۔ حالاں کہ اس کی اصل شخصیت اس کے بول سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

منافق انسان دنیوی پہلو سے بھی ناقابل اعتبار ہوتا ہے، اور دینی پہلو سے بھی ناقابل اعتبار۔ ایسا آدمی اگرچہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح چھپائے رکھے لیکن دوسرے انسان کہیں نہ کہیں اس کو پہچان لیتے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کی نظروں میں اس کا اعتبار ختم ہوجاتا ہے۔

منافق انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک قابل پیشین گوئی کردار (predictable character) کا حامل نہیں ہوتا۔ ایسے انسان کے اوپر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ وہ زبان سے کچھ اور بولتا ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ اپنی گفتگو میں بظاہر اچھا نظر آتا ہے لیکن اپنے حقیقی کردار کے اعتبار سے وہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ منافق آدمی حیوان سے بھی کم تر درجے کا آدمی ہے۔ اس لیے کہ حیوان اپنے کردار کو چھپاتا نہیں، جب کہ منافق ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ اس کا اصل کردار لوگوں کی نظروں سے چھپا رہے۔

خوشی کا حصول

خوشی ہر آدمی چاہتا ہے۔ لیکن مطلوب خوشی کسی کو نہیں ملتی۔ چنانچہ خوشی عملاً ایک ناقابل حصول چیز بنی ہوئی ہے۔ برٹش فلسفی برٹرینڈ رسل نے خوشی (happiness) کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں خوشی کسی کے لیے قابلِ حصول نہیں۔ اس معاملے میں اسلام نے ایک فطری فارمولا اختیار کیا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے اطمینانِ قلب انسان کو صرف اللہ کی یاد (الرعد: 28) سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی قرآن میں دو چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کردیا گیا ہے، مادی لذت (physical pleasure) اور ذہنی اطمینان (intellectual satisfaction)۔ اللہ کے نقشۂ تخلیق کے مطابق، مادی لذت کامل معنوں میں صرف جنت میں ملے گی۔ اس دنیا میں جو چیز مل سکتی ہے، وہ ہے ذہنی اطمینان۔ اور وہ بلاشبہ ہر انسان کے لیے قابلِ حصول ہے۔

ذہنی اطمینان یہ ہے کہ آدمی صورتِ حال کی معقول توجیہہ دریافت کرسکے۔ مثلاً آپ ٹرین پکڑنے کے لیے اسٹیشن گیے۔ آپ اسٹیشن پر ٹرین کے مقرر وقت کے مطابق جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ ٹرین دو گھنٹہ لیٹ ہے۔ اگر آپ کو لیٹ ہونے کا سبب معلوم نہ ہو تو آپ پریشان ہوجائیں گے۔ لیکن اگر آپ کو معلوم ہوجائے کہ ٹرین کے لیٹ ہونے کا واقعی سبب کیا ہے۔ تو آپ مطمئن ہوجائیں گے اور ذہنی سکون کے ساتھ ٹرین کی آمد کا انتظار کریں گے۔

خالق نے موجودہ دنیا کو امتحان کے لیے پیدا کیا ہے اور آخرت کو انعام کے لیے۔ اس لیے موجودہ دنیا میں مادی لذت کسی کو پورے معنوں میں نہیں مل سکتی۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ آدمی صورتِ حال کی توجیہہ کرکے ذہنی اطمینان حاصل کرلے۔ اسلام کے مطابق خوشی کا فارمولا یہی ہے۔ مادی لذت کے معاملے میں آپ یہ کیجیے کہ ملے ہوئے پر قناعت کیجیے۔ اور نہ ملے ہوئے کو آخرت کے خانے میں ڈال دیجیے۔ اس طرح آپ کا ذہن آزاد ہوجائے گا اور واقعات کی صحیح توجیہہ کرکے آپ ذہنی اطمینان حاصل کرلیں گے۔ خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق خوشی کے حصول کا یہی قابلِ عمل فارمولا ہے۔

پختگی کیا ہے

امریکی خاتون جرنلسٹ این لینڈرس (Esther Pauline, alias Ann Landers) 1918 میں پیدا ہوئیں، 2002 میں ان کی وفات ہوئی۔ انھوں نے درست طور پر کہا ہے — پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ پرامن طور پر رہ سکیں جن کو آپ بدل نہیں سکتے:

Maturity is the ability to live in peace with those whom we cannot change.

یہ بلاشبہ ایک دانش مندی کی بات ہے۔ اس بات کو مزید معنوی اضافہ کے ساتھ اس طرح کہا جاسکتا ہے — پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی اپنے منصوبہ کو ان حالات کے مطابق دوبارہ بنا سکے، جن کو وہ بدل نہیں سکتا:

Maturity is the ability to reset your plan according to the situation you cannot change.

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے عمل کے لیے ایک منصوبہ (plan) بناتا ہے۔ مگر تجربے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کا منصوبہ اصولی طور پر بظاہر درست ہونے کے باوجود عملی اعتبار سے ورکیبل (workable) نہ تھا۔

اس تجربے کے بعد آدمی دوبارہ اپنے مقصد کے لیے نیا منصوبہ بناتا ہے، ایسا منصوبہ جو حالات کے مطابق، زیادہ قابل عمل ہو۔ تجربے کی روشنی میں دوبارہ سوچنا اور زیادہ قابل عمل انداز میں اپنا منصوبہ بنانا بلاشبہ دانشمندی ہے۔

کامیاب منصوبہ کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ منصوبہ بنانے والے کے نزدیک درست منصوبہ ہو۔ اسی کے ساتھ لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ حالات کے مطابق، ورکیبل (workable) بھی ہو۔ تجربے کے بعد آدمی کو جب محسوس ہو کہ اس کا منصوبہ قابلِ عمل نہ تھا تو اس کو فوراً اپنے منصوبہ پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

میرٹ کلچر، تعلقات کلچر، تزکیہ کلچر

ترقی یافتہ قومیں (developed nations) میں میرٹ کلچر (merit culture) رائج ہے۔ غیر ترقی یافتہ قوموں (underdeveloped nations) میں تعلقات کلچر کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ربانی معاشرہ وہ ہے جہاں تزکیہ کلچر پایا جائے۔ میرٹ کلچر کے ماحول میں ساری اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی شخص کتنا زیادہ لائق (competent) ہے۔ ایسے ماحول میں لائق آدمی کو جگہ ملتی ہے، اور جو شخص لائق نہ ہو، اس کو رد کر دیا جاتا ہے۔

جس معاشرہ میں تعلقات کلچر کا رواج ہو، وہاں یہ حال ہوتا ہے کہ ہر آدمی ذمہ داروں سے تعلق (contact) بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس کو اپنی ذاتی استعداد بڑھانے کی فکر نہیں ہوتی، البتہ وہ رات دن اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ ذمہ داروں سے خوب تعلق قائم کرے۔ اس کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ تعلقات سے کام بنتے ہیں، نہ کہ ذاتی استعداد سے۔

ربانی معاشرہ ان دونوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ربانی معاشرہ میں ہر ایک کا کنسرن (concern) تزکیہ ہوتا ہے۔ یعنی اپنی اصلاح، اپنے آپ کو اس قابل بنانا کہ وہ اللہ کی عنایتوں کا مستحق قرار پائے، اپنے اندر وہ شخصیت بنانا جس کو شریعت میں مزکّی شخصیت کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ شخصیت جس کو آخرت میں جنت میں داخلہ کے لیے منتخب کیا جائے۔

دوسرے معاشروں میں لوگوں کی توجہ کا مرکز انسان ہوتے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو انسان کی نسبت سے لائق بنانا یا انسان کی نسبت سے اپنے آپ کو قابل قبول بنانا۔ اس کے برعکس، ربانی معاشرہ میں انسان کی توجہ کا مرکز تمام تر صرف اللہ ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں انسان اپنے آپ کو اس نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس نظر سے اس کا رب اس کو دیکھے گا۔ ایسے معاشرہ میں انسان اپنی کامیابی کو آخرت کے اعتبار سے جانچتا ہے، نہ کہ دنیا کے اعتبار سے۔ ایسے معاشرہ میں انسان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ کامیاب انسان وہ ہے جس کو جنت میں داخلہ ملے، اور ناکام انسان وہ ہے جو جنت میں داخلہ سے محروم ہو جائے۔

امن کا مسئلہ

امن (peace) کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے، وہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ اس دنیا کے پیدا کرنے والے نے دنیا کا نظام فطرت کے قانون کے تحت بنایا ہے۔ ہر معاملے کا ایک فطری قانون ہے۔ جو آدمی اس فطری قانون کا اتباع کرے گا، وہ کامیاب ہوگا۔ اور جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا، وہ ناکام ہو کر رہ جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ دنیا کے خالق نے ہر انسان کو آزادی عطا کی ہے۔ ہر انسان پوری طرح آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کرے، اور جو چاہے نہ کرے۔ اس بنا پر ہر سماج میں امکانی طور پر ٹکراؤ کا ماحول قائم ہوجاتا ہے۔ ایک شخص کی آزادی دوسرے شخص کی آزادی سے ٹکراتی ہے۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جو ہر سماج میں نفرت اور تشدد کا ماحول پیدا کر دیتی ہے۔

اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ کوئی شخص اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ لوگوں سے ان کی آزادی چھین لے۔ ایسی حالت میں کسی سماج میں امن صرف اس وقت قائم ہوسکتا ہے، جب کہ لوگ ایسا فارمولا دریافت کریں، جس میں آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے، امن قائم ہوجائے۔ یہ فارمولا صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے اصولِ اعراض (principle of avoidance)۔ یعنی ٹکراؤ سے ہٹ کر کے اپنا سفر طے کرنا۔

اعراض کا اصول ایک کائناتی اصول ہے۔ کائنات اسی اصول پر قائم ہے۔ کائنات میں بے شمار ستارے اور سیارے ہیں۔ ہر ایک مسلسل طور پر خلا میں حرکت کر رہا ہے۔ مگر ان کے درمیان کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر ستارہ اور سیارہ اصول اعراض کے مطابق، اپنے اپنے مدار (orbit) پر گردش کر رہا ہے۔ یہی اصول انسانوں کو بھی اپنی چوائس سے اختیار کرنا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں جس کے ذریعے انسانی دنیا میں امن قائم ہو سکے۔ امن کا معاملہ مذہبی عقیدہ کا معاملہ نہیں، بلکہ وہ فطرت کا معاملہ ہے۔ امن ہر ایک کی ضرورت ہے، خواہ وہ مذہبی انسان ہو یا سیکولر انسان۔

جنگ کوئی انتخاب نہیں

امریکا کی قیادت میں صدام حسین کے خلاف عراق کی جنگ ہوئی۔ یہ جنگ 2003 سے 2009 تک جاری رہی۔ اس جنگ میں بظاہر امریکا کو جیت ہوئی۔ لیکن اس کے بعد اسلامک اسٹیٹ آف عراق اینڈ سیریا (ISIS) کی صورت میں ایک شدید تر مسئلہ پیدا ہوگیا۔ سابق برطانی وزیر اعظم ٹونی بلیر جو اس جنگ میں بطور حلیف شریک تھے، انھوں نے اس جنگ کو ایک غلطی قرار دیا ہے:

> Iraq war contributed to rise of IS: Britain's former PM Tony Blair has apologised for mistake made over the Iraq war and said there were "elements of truth" to claims that the 2003 US-led invasion was the principle cause of the rise of IS. (*The Times of India*, New Delhi, October 26, 2015, p.22)

اس معاملے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ عراق وار انتخاب کی غلطی کا ایک کیس تھا۔ اس جنگ میں امریکا اور برطانیہ کے چار ہزار سے زیادہ فوجی مارے گیے۔ اس جنگ کا خرچ تقریباً تین ٹریلین ڈالر تھا۔ لیکن نتیجہ برعکس صورت میں نکلا، خلیج کا مسئلہ پہلے سے بھی زیادہ شدید ہوگیا۔

اصل یہ ہے کہ جنگ کی نفسیات کے مطابق، جنگ کا خاتمہ اس طرح نہیں ہوتا کہ ایک فریق دوسرے فریق کو ہرا دے۔ عملاً یہ ہوتا ہے کہ ہارا ہوا فریق اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اس کے اندر انتقام (revenge) کی نفسیات جاگ اٹھتی ہے۔ منفی ردعمل کا یہ جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ اگر اس کے اندر جوابی جنگ کی طاقت نہ ہو تو وہ خودکش بمباری (suicide bombing) کا طریقہ اختیار کرلیتا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو ہلاک کرکے فریقِ ثانی کو نقصان پہنچانا۔ جنگ کوئی انتخاب (choice) نہیں۔ صحیح انتخاب یہ ہے کہ جنگی صورتِ حال کو پرامن طور پر مینج کرنے کی کوشش کی جائے۔ اپنے آپ کو مثبت بنیادوں پر اتنا طاقت ور بنایا جائے کہ خود مثبت تعمیر فتح کے لیے کافی ہوجائے۔

سماجی تعلقات

قرآن میں انسانی زندگی کے ایک پہلو کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا (25:54) اور وہی ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا۔ اور تمھارا رب بڑی قدرت والا ہے۔

انسان کو سماجی حیوان (social animal) کہا جاتا ہے۔ حیوانوں کے اندر سماجی تعلقات نہیں ہوتے۔ جب کہ انسانوں کے درمیان سماجی تعلقات ہوتے ہیں۔ یہ سماجی تعلقات دو طریقہ سے قائم ہوتے ہیں۔ ایک، خونی رشتہ (blood relationship) کے ذریعے، اور دوسرے، ازدواجی تعلقات (wedlock) کے ذریعے۔ یہ دونوں چیزیں فطری طور پر انسان کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ انسان کی اسی فطرت کی بنا پر سماج (society) بنتا ہے، اور اسی کی ترقی سے تہذیب وجود میں آتی ہے۔ انسانوں کے درمیان اگر سماج نہ ہو تو تہذیب کا وجود بھی نہ ہوگا۔

انسان کو اللہ تعالی نے جن امتیازی اوصاف کے ساتھ پیدا کیا ہے، ان میں سے ایک اہم صفت وہ ہے جو قرآن کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ انسان کے اندر فطری طور پر رشتے کے مذکورہ اسباب موجود نہ ہوں تو انسانوں کے درمیان سماج نہیں بنے گا۔ اور اگر سماج نہ بنے تو انسانوں کے اندر اجتماعیت وجود میں نہ آئے گی۔ انسان بھی اسی طرح جنگلوں میں رہے گا، جس طرح حیوانات جنگلوں میں رہتے ہیں۔

جنگل میں حیوانات رہتے ہیں لیکن ان کے درمیان سماجی نوعیت کا کوئی نظام نہیں ہوتا۔ سماجی تعلقات صرف انسان کی صفت ہے۔ سماجی تعلقات کی بے حد اہمیت ہے۔ اسی سماجی تعلقات کی وجہ سے انسانی زندگی کی تمام ترقیاں ہوتی ہیں۔ حتی کہ تہذیب اسی سماجی زندگی کا ایک اعلی اظہار ہے۔ سماجی تعلقات نہ ہوں تو انسانی زندگی بھی حیوانی زندگی بن کر رہ جائے گی۔

شادی کا مسئلہ

ایک صاحب نے اپنی پسند کی ایک خاتون سے شادی کی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد ان سے میری ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ شادی سے پہلے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا ہوائی جہاز فضا میں اڑ رہا ہے۔ مگر شادی کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے کہ میرا جہاز کریش (crash) ہوگیا، اور میں جہاز کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔

یہ ایک شخص کی بات نہیں۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کے معاملے میں اکثر لوگوں کا احساس کم وبیش یہی ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عورت اپنے مزاج کے اعتبار سے جذباتی ہوتی ہے۔ بچپن سے شادی کی عمر تک وہ اپنے خونی رشتوں کے درمیان رہتی ہے۔ اس بنا پر اس کو اپنے خونی رشتوں سے خصوصی لگاؤ ہوجاتا ہے۔ جب کہ شادی کے بعد اس کو اپنے سسرالی رشتوں (in laws) کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ عورت، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اپنے آپ کو اس فرق کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر پاتی۔ اس سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اور شادی عملاً، پرابلم میرج (problem marriage) بن جاتی ہے۔

اس مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ سسرالی رشتوں اور غیر سسرالی رشتوں کا فرق ختم ہو۔ یہ ایک فطری فرق ہے جو ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس مسئلے کا عملی حل صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی شعوری طور پر یہ جان لے کہ وہ ایک فطری مسئلہ سے دوچار ہے۔ جس کو وہ ختم نہیں کرسکتا۔ آدمی اگر شعوری طور پر اس بات کو جان لے تو اس کے اندر ایڈجسمنٹ (adjustment) کا مزاج پیدا ہوگا۔ اس کے اندر یہ سوچ بیدار ہوجائے گی — جس مسئلے کو میں بدل نہیں سکتا اس کو مجھے نبھانا چاہیے، اس کے ساتھ مجھے ایڈجسٹ کرکے رہنا چاہیے۔ اس فرق کا ایک مثبت پہلو ہے۔ یہ فرق آدمی کو ذہنی جمود (intellectual stagnation) سے بچاتا ہے۔ اس بنا پر آدمی کے اندر ذہنی ارتقا کا عمل رکے بغیر جاری رہتا ہے۔

غیر ادیب کی ادبی تخلیق

ایک طالب علم نے ادب کے موضوع پر ایک کتاب لکھی۔ اس نے اپنی یہ کتاب ایک اسکالر کو یہ کہہ کر پیش کی کہ یہ میری پہلی تخلیق ہے۔ اسکالر نے کتاب دیکھ کر کہا کہ یہ ایک غیر ادیب کی ادبی تخلیق ہے۔ اسی طرح ایک شخص نے ایک غیر علمی کتاب لکھی اور اس کو شائع کیا۔ ایک عالم نے کتاب دیکھنے کے بعد تعجب سے کہا: ایک غیر مصنف نے تصنیف تیار کی ہے۔

یہ کلچر غیر ترقی یافتہ ملکوں میں بہت عام ہے۔ یہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک غیر امام، امام بن جاتا ہے۔ ایک غیر لیڈر، لیڈر بن جاتا ہے۔ ایک غیر عالم، عالم بن جاتا ہے۔ ایک غیر ڈاکٹر، ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ ایک غیر مصنف، مصنف بن جاتا ہے۔ ایک غیر صحافی، صحافی بن جاتا ہے، وغیرہ۔ اس قسم کی صورتِ حال کو دیکھ کر ان ملکوں میں ایک مثل عام ہے — نیم حکیم خطرۂ جان، نیم ملا خطرۂ ایمان۔

میری ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ مجھے آپ کی کتابیں بہت پسند ہیں۔ میں بھی اسی طرح کی کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں مشورہ دیجیے۔ میں نے کہا: آپ بیس سال عربی کتابیں پڑھیے۔ بیس سال انگریزی کتابیں پڑھیے۔ بیس سال لکھنے کی مشق کیجیے۔ اس کے بعد آپ کو لکھنا آجائے گا۔

کسی کام کو اچھی طرح انجام دینے کے لیے لمبی مدت تک تیاری کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بغیر لمبی مدت کی تیاری کے کوئی شخص قابلِ ذکر کام انجام نہیں دے سکتا۔ اس حقیقت کو الطاف حسین حالی نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق　　　رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

علی ابن ابی طالب کا ایک قول ہے: قیمة کل امرء ما یحسن (جامع بیان العلم، حدیث نمبر: 608)۔ زندگی کا اصول یہ ہے کہ آدمی یہ دریافت کرے کہ وہ کس کام کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے، اسی کو وہ انجام دے۔ کم تر درجے کا کام انجام دینا صرف وقت کا ضیاع ہے، اس کا کوئی حقیقی فائدہ نہیں۔

ریزرویشن کے بغیر

ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا میں مسلمانوں کے لیے ریزرویشن بہت ضروری ہے۔ ریزرویشن کے بغیر وہ اس ملک میں ترقی نہیں کرسکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا ہو یا کوئی دوسرا ملک، ہر جگہ فطرت کا ایک ہی اٹل قانون ہے۔ اس قانون کے مطابق، ریزرویشن کسی کمیونٹی کے لیے ترقی کا ذریعہ نہیں۔

ریزرویشن، برعکس طور پر، ترقی میں رکاوٹ ہے۔ ریزرویشن آدمی کے اندر کامپٹیشن کی اسپرٹ ختم کردیتا ہے۔ ریزرویشن کے ذریعے کسی کو کوئی معمولی فائدہ تو مل سکتا ہے۔ لیکن ریزرویشن کے ذریعے بڑی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اگر آپ کسی کو فیور نہ دیں تو آپ اس کو زیادہ بڑی چیز دیتے ہیں۔ اور وہ محنت کا محرک (incentive) ہے۔

فیور نہ ملنے کی وجہ آدمی کے اندر یہ سوچ جاگتی ہے کہ مجھے کسی کی مہربانی سے کچھ ملنے والا نہیں۔ اس بنا پر میرے لیے ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ محنت کرکے میں میرٹ (merit) میں آنے کی کوشش کروں۔ یہ سوچ اس کے اندر محنت کے حق میں ایک کمپلشن (compulsion) پیدا کرتی ہے۔ اس کی سوئی ہوئی طاقتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ پہلے اگر وہ مین (man) تھا تو اب وہ سوپر مین (superman) بن جاتا ہے۔ اور آخر کار بڑی کامیابی تک پہنچ جاتا ہے۔

محنت کے ذریعے آگے بڑھنے والے انسان کے اندر اور بھی کئی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے اندر خود اعتمادی (self-confidence) پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اندر حقیقت پسندی (realistic approach) آتی ہے۔ اس کے اندر شکایت کی نفسیات ختم ہوجاتی ہے۔ وہ دوسروں کے لیے اچھی مثال قائم کرتا ہے۔ وہ وقت اور مال دونوں کے استعمال کے معاملے میں سخت محتاط ہوجاتا ہے۔ وہ سماج کا ایک دینے والا (giver) ممبر بن جاتا ہے۔

معکوس پبلسٹی

عبداللہ اینڈ کمپنی لمیٹیڈ ایک سگریٹ ساز کمپنی تھی جو 1902 میں لندن میں قائم ہوئی۔ وہ سگار اور سگریٹ بناتی تھی۔ اس کمپنی کا ایک سگریٹ جس کا نام عبداللہ تھا، بہت مقبول ہوا۔ اس مقبولیت کا راز یہ ہے کہ کمپنی کے کچھ آدمی مشہور برٹش رائٹر جارج برنارڈ شا (George Bernard Shaw) (وفات: 1950) کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آپ ہماری سگریٹ کے بارے میں کچھ لکھ دیجئے۔ برنارڈ شا نے کہا: میں اسموکنگ کے خلاف ہوں، میں کیسے اس کے بارے میں لکھوں۔ کمپنی والوں نے کہا کہ آپ یہی بات لکھ دیجئے۔ برنارڈ شا غصہ ہو گیا۔ اس نے غصے میں ایک کاغذ اٹھایا اور اس پر یہ الفاظ لکھ دیئے:

"Don't smoke, even Abdulla",

کمپنی والوں نے برنارڈ شا کے الفاظ اخبار میں چھاپ دیئے۔ جب لوگوں نے برنارڈ شا کا یہ ریمارک پڑھا تو عبداللہ سگریٹ کے بارے میں ان کا شوق بڑھ گیا۔ سگریٹ کی دکانوں پر عبداللہ سگریٹ خریدنے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ یہاں تک کہ عبداللہ سگریٹ اس زمانے کا سب سے زیادہ بکنے والا سگریٹ بن گیا، کمپنی والوں نے اس سے بہت پیسہ کمایا۔

اگر بولنا الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا ہو تو آدمی کو چاہئے کہ وہ چپ رہے۔ کبھی خاموشی کے ذریعے وہ مقصد زیادہ بہتر طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے جس مقصد کو انسان بول کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ اصل چیز نتیجہ ہے نہ کہ بولنا۔

اس دنیا میں جس طرح بولنا ضروری ہے، اسی طرح چپ رہنا بھی ضروری ہے۔ یہ آدمی کی دانش مندی کا امتحان ہے کہ وہ یہ جانے کہ کب اس کو بولنا ہے اور کب اس کو بولنے سے رک جانا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ حالات کا جائزہ لے، وہ نتیجہ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے عمل کا منصوبہ بنائے۔ عمل وہی درست ہے جو نتیجہ خیز ہو۔

سوال وجواب

سوال

غیبت اور تنقید میں کیا فرق ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔ (شہنواز ظفر، دہلی)

جواب

غیبت کا حکم قرآن کی سورہ الحجرات آیت نمبر 12 میں آیا ہے۔ اسی طرح غیبت کے بارے میں ایک مشہور حدیث ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم حدیث نمبر 2589 کے تحت موجود ہے۔ علماء نے اس پر کافی لکھا ہے۔ آپ اس کے بارے قرآن کی تفسیروں اور حدیث کی شرحوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

غیبت کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے: آدمی کسی شخص کے پیٹھ پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہے جو اگر اسے معلوم ہو تو اس کو ناگوار گزرے۔ یہ غیبت کی درست تعریف ہے۔ لیکن تنقید (criticism) کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ غیبت اور تنقید کو ہم معنی سمجھنا صحیح نہیں۔

غیبت کی اصل پیٹھ کے پیچھے برائی کرنا (backbiting) ہے۔ یہ بلاشبہ ایک اخلاقی برائی ہے۔ اور قرآن وحدیث میں جس چیز کو برا بتایا گیا ہے وہ یہی غیر اخلاقی عادت ہے۔ کسی کی برائی اگر اس کے سامنے کی جائے تو اس آدمی کو موقع ہوتا ہے کہ وہ اس کی وضاحت کرے۔ آدمی کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کرنا اس لیے غلط ہے کہ اس کی وضاحت کرنے کے لیے وہ وہاں موجود نہیں ہوتا۔

غیبت ایک اخلاقی برائی ہے۔ اس کے مقابلے میں تنقید ایک علمی ضرورت ہے۔ اس اعتبار سے تنقید کا زیادہ درست لفظ تجزیہ (analysis) ہے۔ تجزیہ ایک ایسی علمی ضرورت ہے جس کے بغیر علم کا ارتقاء نہیں ہوسکتا۔ تنقید کو غیبت کے ہم معنی سمجھنا اور اس پر پابندی لگانا علمی ترقی اور ذہنی ڈیولپمنٹ (intellectual development) کو ختم کردیتا ہے۔ اس کے بعد جو چیز باقی رہتی ہے، وہ ذہنی جمود (intellectual stagnation) ہے۔ علمی تنقید کا تعلق کسی شخص کی ذاتی برائی بیان کرنا نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ معلوم حقائق (known facts) کی بنیاد پر کسی

کے نقطہ نظر کا صحت وسقم بیان کرنا۔

شخصی برائی اور علمی تجزیہ کے درمیان یہ فرق ہے کہ شخصی برائی کا صحیح یا غلط ہونا صرف وہی آدمی جان سکتا ہے جس کی ذات کے بارے میں برائی کی گئی ہو۔ اس کی ذات کے باہر ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس کی ذات کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ اسی لیے شخصی برائی (غیبت) کی یہ لازمی شرط ہے کہ اس کو جب بیان کیا جائے تو وہاں خود وہ شخص موجود ہو جس کی ذات کے بارے میں برائی بیان کی گئی ہے۔

تجزیاتی تنقید (critical analysis) کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ تجزیاتی تنقید ہمیشہ معلوم حقائق (known facts) کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں ہمیشہ خارجی ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔ اس لیے ریکارڈ سے تقابل کرکے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ تنقید کرنے والے کی تنقید درست تھی یا غلط۔

مثلاً اگر آپ کسی کے بارے میں یہ کہیں کہ وہ منافق ہے۔ تو یہ قول ایک سبجکٹیو (subjective) قول ہوگا۔ اس قول کی تحقیق کرنے کے لیے کوئی خارجی مواد نہیں ملے گا۔ اس لیے اس طرح کے بیان کے لیے ضروری ہے کہ متعلق شخص وہاں موجود ہو تاکہ وہ ایسے کسی قول کی خود سے وضاحت کر سکے۔ اس کے برعکس، اگر آپ کسی کے بارے میں یہ کہیں کہ اس نے اپنی فلاں مطبوعہ کتاب میں فلاں واقعہ کی تعریف غلط لکھی ہے، تو ہر شخص کو یہ موقع ہوتا ہے کہ وہ اس مطبوعہ کتاب کو حاصل کرے اور تاریخی ریکارڈ سے تقابل کرکے اس بیان کا صحیح یا غلط ہونا معلوم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص کی ذات کے بارے میں تنقیص ناجائز ہے۔ اور کسی شخص کی بات کا علمی تجزیہ کرنا عین جائز ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز—243

1۔ ابھی حال میں صدر اسلامی مرکز کے ترجمہ قرآن کو فرنچ زبان میں گڈورڈ بکس (نئی دہلی) نے شائع کیا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں تک زیادہ سے زیادہ قرآن کو پہنچانا ہے۔ اس فرنچ ترجمہ کو مزشہناز بنبیکٹا نے صدر اسلامی مرکز کے ترجمہ قرآن (انگلش) سے تیار کیا ہے۔ وہ پیرس (فرانس) میں رہتی ہیں۔

2۔ ندوۃ المجاہدین (کیرلا) کے اسٹیٹ جنرل سکریٹری جناب صلاح الدین مدنی نے صدر اسلامی مرکز کے امن کے موضوع پر منتخب انگریزی مضامین کو ملیالم زبان میں ''*Samathanathintey Samskaram*'' یعنی 'کلچر آف پیس' کے نام سے ریلیز کیا۔ اس موقع پر سیاسی پارٹی کے لیڈران بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ مسٹر شبیر علی، چیپٹر ہیڈ کیرالا ٹیم نے صدر اسلامی مرکز کے پیس مشن کا تعارف کرایا اور تمام شرکاء کے درمیان ملیالم زبان میں دعوتی لٹریچر تقسیم کیا گیا۔

3۔ 21 فروری 2016 کو سری فورٹ آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں واک آف ہوپ (Walk of Hope) کی طرف سے ایک پروگرام منعقد ہوا۔ یہ این جی او امن وبھائی چارہ کے لیے کام کرتی ہے۔ اس میں صدر اسلامی مرکز نے خطاب کیا۔ اس کے علاوہ سی پی ایس دہلی کے ممبران نے پروگرام میں شریک ہونے والوں کے درمیان دعوہ لٹریچر تقسیم کیا۔

4۔ 26 فروری 2016 کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، لودھی روڈ، نئی دہلی میں اسپریچول وزڈم اینڈ ہولسٹک ورلڈ آرڈر کے عنوان سے ایک کانفرس کا انعقاد ہوا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز نے بین مذاہب تعلقات کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ رہی کہ آرگنائزر نے خود سے صدر اسلامی مرکز کے ترجمۂ قرآن اور دیگر دعوتی لٹریچر کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا، نیز پروگرام کے مقام پر ایک کارنر میں دعوتی لٹریچر رکھنے کا موقع دیا۔ تمام لوگوں نے خوش دلی سے ترجمہ قرآن اور سپورٹنگ لٹریچرس حاصل کیا۔

5۔ 28 فروری 2016 کو اٹلی کے ایک وفد نے مسٹر ماریو کونتی (Mario Conti) کی قیادت میں صدر اسلامی مرکز سے ان کی رہائش گاہ، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی میں ملاقات کی۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔ اس کے بعد ان کو دعوہ لٹریچر گفٹ کیا گیا۔ اس موقع پر ثانی اثنین خاں کی انگریزی کتاب ''مائی فرسٹ قرآن اسٹوری بک'' کے اٹالین زبان میں ترجمے کا اجرا بھی کیا گیا۔ واضح رہے کہ یہ گروپ اس سے پہلے بھی صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کر چکا ہے۔

6۔ گڈ ورڈ بکس (Goodword Books) نے مختلف انٹرنیشنل بک فیر میں شرکت کی۔ جیسے مسقط بک فئیر، عمان، چائنا بک فیر، دبئی بک فیسٹیول وغیرہ۔ ان تمام بک فیئر میں آنے والے لوگوں کے درمیان ترجمہ قرآن اور دعوہ لٹریچر تقسیم کیا گیا۔

7۔ کشمیر میں بڑے پیمانے پر دعوتی کام کیا جارہا ہے۔ حال ہی میں شمالی کشمیر میں تعینات فوجیوں کے

درمیان تقسیم کرنے کے لئے 400 ترجمہ قرآن بھیجے گئے اور 100 ترجمہ قرآن ہماچل پردیش ہائی کورٹ کے ججوں اور وکلاء کے لئے بھیجے گئے۔ اس کے علاوہ ہوٹلوں کے ذریعہ سیاحوں کے درمیان بڑے پیمانے پر دعوتی کام کیا جارہا ہے۔ جناب عبد السلام حمید نجار (منیجر ہوٹل دار السلام، سری نگر) ہوٹل میں آنے والے لوگوں کو ترجمہ قرآن پیش کرتے ہیں۔ اور 100 کا پیاں پنجاب ہوٹل (سری نگر) میں سیاحوں کے لئے رکھی گئی ہیں۔ نیز سری نگر کے دیگر ہوٹلوں میں بھی انگلش ترجمہ قرآن سیاحوں کے لئے رکھے گئے۔ واضح ہو کہ کشمیر میں آنے والے سیاحوں کی اکثریت یورپ کی ہوتی ہے۔ جن کے درمیان یہ کام کشمیر ٹیم کے تعاون سے انجام دیا جارہا ہے۔ (مسٹر حمید اللہ حمید، کشمیر)۔

8۔ 27 مارچ 2016 کو انگلش میگزین لائف پازیٹیو نئی دہلی کی طرف سے انڈیا ہیبیٹیٹ سنٹر (نئی دہلی) میں ایک پروگرام کا انعقاد ہوا۔ یہ پروگرام میگزین کے بیسویں سالگرہ کی مناسبت سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر کرن سنگھ (ایم پی، راجیہ سبھا) بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ اس پروگرام میں صدر اسلامی مرکز نے حاضرین سے خطاب کیا۔ دوران پروگرام سی پی ایس ممبران نے لوگوں میں دعوہ لٹریچر تقسیم کیا۔

9۔ صدر اسلامی مرکز نے 20 مارچ 2016 کے اپنے سنڈے خطاب میں اسوہ رسول پر خطاب کیا۔ اس خطاب کا پس منظر یہ تھا کہ لاہور میں سی پی ایس پاکستان نے ایک سینٹر کا افتتاح کیا ہے۔ اس مناسبت سے سی پی ایس پاکستان سے تعلق رکھنے والے تقریباً 50 ممبران مختلف علاقوں سے لاہور میں اکٹھا ہوئے تھے۔ انھوں نے اجتماعی طور پر صدر اسلامی مرکز کا خطاب سنا اور سی پی ایس کے پیغام کو پاکستانی عوام تک پہنچانے کے عہد کی تجدید کی۔

10۔ پاکستان سے موصول ہونے والی ایک اور خبر کے مطابق، 23 مارچ 2016 کو سی پی ایس راولپنڈی (پاکستان) کی خواتین کا ہفتہ وار اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں مس شبانہ ادیب نے تذکیر القرآن سے سورہ شعراء کی آخری آیات کی تفسیر بتائی۔ حدیث کے بعد الرسالہ مارچ 2016 کے مضمون ''شخصیت کی تعمیر'' اور واٹس ایپ (+919999944119) سے موصول ہونے والے لکچر ''لیک آف تھنکنگ'' (Lack of Thinking) پر ڈسکشن ہوا۔ اس کے بعد صدر اسلامی مرکز کی کتاب ''اسلام ایک تعارف'' سے ایک چیپٹر پڑھ کر سنایا گیا۔ آخر میں دعا کے بعد یہ پروگرام ختم ہوا۔

11۔ 31 مارچ 2016، سی پی ایس راولپنڈی کی ممبر شبانہ ادیب نے رزلٹ ڈے پر مقامی اسکول میں الرسالہ اور مولانا کی دیگر کتابیں اساتذہ، والدین اور مہمانان خصوصی میں تقسیم کیں۔ تمام لوگوں نے ان کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

12۔ 20 مارچ 2016 کو انڈیا ہیبیٹٹ سنٹر میں پنگوئن انڈیا اور اسپرنگ فیور کے اشتراک سے ایک

لٹریری فیسٹ کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر سی پی ایس دہلی کی ایک ٹیم نے ترجمہ قرآن اور دعوہ لٹریچر لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ شرکاء نے نہایت خوشی اور جذبہ تشکر کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ قرآن حاصل کرنے کے لئے لوگوں میں اتنا زیادہ شوق تھا کہ پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہی پورا اسٹاک ختم ہو گیا۔ ایک خاتون نے اپنے تبصرہ میں کہا کہ خدا مجھ سے چاہتا ہے کہ میں اس کو پڑھوں۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اس کو پہنچانا ہے۔ یہ الفاظ جہاں مثبت اور حوصلہ بخش پیغام دے رہے ہیں وہیں ہماری ذمہ داریوں کو مزید بڑھا رہے ہیں۔

13۔ 3 اپریل 2016 کو صدر اسلامی مرکز نے C-29 نظام الدین ویسٹ میں ''مولانا وحید الدین خاں پیس فاؤنڈیشن'' کا افتتاح کیا۔ اس فاؤنڈیشن کا مقصد سیکولر دنیا میں اسلام کا مثبت تعارف کرانا ہے۔ اس موقعے پر صدر اسلامی مرکز نے دعوت کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر کو سی پی ایس کی ویب سائٹ پر پوڈ کاسٹ (Podcast) کے تحت سنا جا سکتا ہے۔ اس خطاب کو سن کر مس شبینہ مہتاب نے اپنے گہرے تاثر کا اظہار اس طرح کیا: آپ کا ہر ہر لفظ اتنا زیادہ متاثر کرتا ہے کہ وہ سیدھا دل و دماغ میں اتر جاتا ہے۔ آپ کا خطاب سننے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارا پہلا اور آخری کام دعوتی عمل ہے۔

14۔ 7 اپریل 2016 مسٹر اشوک تیاگی (جنرل سکریٹری، انٹرنیشنل چیمبر آف میڈیا اینڈ انٹرٹینمینٹ انڈسٹری) نے صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ اور روحانیت اور امن پر تبادلہ خیال کیا۔ آخر میں ان کو صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک سیٹ دیا گیا۔ موصوف نے شکریہ کے ساتھ اسے قبول کیا۔

15۔ 13-17 اپریل 2016 کے درمیان سی پی ایس ممبئی اور حیدر آباد ٹیم اور تامل ناڈو ٹیم نے چنئی میں دعوۃ میٹ کا انعقاد کیا۔ اس کا مقصد دعوتی مواقع کو استعمال کرنا اور دعوہ ورک کو اپنے چیپٹر کے اندر تحریک دینا اور داعی ہنٹنگ تھا۔ چنئی میں مختلف پروگرام اور لوگوں سے ملاقات کے علاوہ، میٹ کے شرکاء نے تامل ناڈو کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ مثلاً کوئمبتور، آمبور وشارم، وانمباڑی، اور عمر آباد۔ اس میں الرسالہ کے قارئین، علماء اور مسلم و غیر مسلم قائدین سے ملاقات کی گئی، اور اسلام کے پر امن مشن کو آگے بڑھانے پر اتفاق کیا گیا۔

16۔ 16 اپریل 2016 کو سی پی ایس سہارن پور کی ٹیم نے ڈاکٹر اسلم خان کی قیادت میں واگھہ بارڈر کا دورہ کیا۔ اس کا مقصد دونوں قوموں کے درمیان امن کے پیغام کو پہنچانا تھا۔ بارڈر پر موجود انڈیا کے افسران نے سی پی ایس ٹیم کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ ٹیم نے ہند — پاک بارڈر پر دعوت کا کام کیا۔ اور بارڈر انچارج جناب ہرمندر سنگھ کے ساتھ انٹرایکشن کیا۔

ذیل میں کچھ تاثرات دیے جا رہے ہیں:

- میں نے ایک صاحب کو انگلش ترجمہ قرآن گفٹ کیا۔ وہ چند سکنڈ میری طرف دیکھتے رہے پھر انھوں

نے کہا کہ میں نے سعودی عرب میں 5 سال سے زیادہ کام کیا ہے۔ وہاں پر کسی نے مجھ کو قرآن کی ایک بھی کاپی نہیں دی تا کہ میں اس کو سمجھ سکوں۔ انھوں نے کچھ مزید نسخے مانگے تا کہ وہ انھیں اپنے احباب کو دے سکیں۔ وہ اب بھی میرے رابطے میں ہیں۔ (نغمہ صدیقی، نئی دہلی)

- آپ کی کتابوں نے میری پوری زندگی کو بدل دیا ہے۔ اللہ آپ کو آخرت میں نوازے۔ (جاوید اقبال، ویسٹ بنگال)

- سی پی ایس کی طرف سے پوری دنیا میں مسلم اور غیر مسلم حضرات کو ترجمہ قرآن پوسٹ کے ذریعے ارسال کیا جاتا ہے۔ ترجمہ قرآن کی کاپی موصول ہونے کے بعد ایک صاحب نے اپنے گہرے تاثر اور شکریہ کا پیغام ان الفاظ میں بھیجا ہے:

Dear Team CPS, I am very pleased to see that this copy of the Holy Book has been delivered to me via post. It is a great pleasure for me to have this wonderful book. And the best thing is that it has translation along with it. Now I can easily understand the Holy Quran without any difficulties. May God bless you for such a wonderful job you are doing. Thank you. (Abdul Muizz)

- امریکا میں خواجہ کلیم الدین صاحب نے ایک جیل میں انگلش ترجمہ قرآن بھیجا تھا۔ اس پر درج ذیل ای میل موصول ہوئی:

May Allah reward you for sending copies of the Quran! It is a great help in dawah. (Khalil Abdul Khabir, Chaplain, Onondaga Correctional Facility, New York)

- بنگلور ٹیم نے کرشچن انٹرفیتھ کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ اس پر بنگلور ٹیم کو شکریہ کا درج ذیل خط موصول ہوا:

Dear Madam Fathima Sarah, Thank you so much for your presentation at our Indian Theological Meeting. You have presented a very refreshing and inspiring vision of Islam with much clarity and conviction. All our participants appreciated your presentation. Ultimately, what God wants from us is to live as authentic humans and relate with one another as humans and bring glory to God. May God bless you for all your good works! (Fr Jacob Parappally, 27 April 2016, 39th Annual Meet and Conference, Bangalore)

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔ الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1۔ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 33 فی صد ہے۔ 50 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 40 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ 2۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ 3۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تین مہینے تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

	ہندستان کے لئے — بذریعہ سادہ ڈاک	ہندستان کے لئے — بذریعہ رجسٹری ڈاک	بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 200	Rs. 400	$20
دوسال	Rs. 400	Rs. 800	$40
تین سال	Rs. 600	Rs. 1200	$60

ہر اتوار 10.30 AM کو صدر اسلامی مرکز کی تقریر کو لائیو دیکھنے کے لیے اِن لنکس پر کلک کریں:

www.fb.com/maulanawkhan

http://www.ustream.tv/channel/cps-international **(For High Speed)**

http://m.ustream.tv/channel/cps-intl-slow **(For Slow Speed)**

مزید اردو اور انگلش ویڈیو، آڈیو دیکھنے، سننے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے ان پیجز پر جائیں:

http://www.cpsglobal.org/videos

http://www.cpsglobal.org/podcasts

الرسالہ مشن کی مطبوعات، ماہنامہ الرسالہ (اردو، انگلش)، نیز دعوتی لٹریچر درج ذیل پتے پر دستیاب ہیں:

UTTAR PRADESH
Mehtab Ahmad
Quran Book Depot
Neza Sarai, Pahari Darwaza,
Dhampur, Bijnor, U.P. 246761,
Mob. 07599314251

Dr. M. Aslam Khan (Principal)
NMCC (IGNOU)
38 Ayodhyapuram, Mahipura,
Dehradun Road, Saharanpur, U.P.
Mob. 91- 9997153735

Muhammad Abrar
Nirala Sweet House
(Goodword Book Distributor)
Kareli, Allahabad, U.P.
Mob. 9918228299, 9889041673

BIHAR
CPG Message Forum
At+P.O. Bahadurganj, Main Road
Dist. Kishanganj. Pin-855101, Bihar
Mob. 9470272115, 9430900563

A. H. M. Danyal
(President, Centre for Peace)
Mahatwana, Phulwarisharif
Patna-601505, Bihar
Mob. 09308477841, 09852208744

Mokhtar Ahmad
Frontier Coaching
Near Urdu Government
Middle School, Gewal Bigha
Gaya, Bihar-823001
Mob. 09771878964

Kitab Manzil
Jama Masjid, Main Road, Motihari
East Champaran-845401, Bihar
Mob. 09973360552

MADHYA PRADESH
Mr. Bilaluddin
Al-Quran Mission
48, Aamwali Masjid, Jahangirabad
Bhopal (M.P.)
Mob. 09755300295, 07556542231

Shahid Khan
Yashika Books
Imami Gate Bus Stop, Imami Gate
Bhopal-462 001, M.P.
Mob: 9300908081

MAHARASHTRA
Mr Usman
Distributors: Goodword Books
71/1, Plot No. 11, Ansar Colony,
Near Maharashtra Sizing,
Malegaon, Dist. Nashik
Maharashtra -423203
Mob. 08983759678

Md. Mukhtar Ansari,
Near Kamil Ansari House,
Bhankheda, Mominpura, Nagpur (MH)
Mobile- 9371745384

JHARKHAND
Ayaz Ahmad
Holding- Sae'ban, Gulzar Bagh Colony,
Near Amar Jyoti School, Chapal Pul,
Pardeeh, Jamshedpur, Jharkhand-831022
Mobile No. 9199248371, 903196239

KARNATAKA
Mahboob Book Depot
Opp. Russel Market,
Shivajinagar,
Bangalore-560 051
E-mail: faizan500@gmail.com
Ph. 080-22867138, 09538293903,

TAMIL NADU
Goodword Books, Chennai
324, Triplicane High Road
Triplicane, Chennai-600005
Tel. +9144-4352-4599
email: chennaigoodword@gmail.com
Mob. +91-9790853944, 9600105558

TELENGANA
Goodword Books, Hyderabad
email: hyd.goodword@gmail.com
Tel. 040-23514757, Mob. 07032641415

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2015-17
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2015-17